حکمتِ الٰہیہ کی روشنی میں

زمانے کی ماہیت اور مُقدّرِ انسانی

عبدالحمید کمالی

گزشتہ مضامین و مباحث میں سے گزرتے ہوئے زماں کے بارے میں جو احساس سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ زماں نہ تو ایک تجرید ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی وہم مزید براں یہ کوئی زائد حقیقت بھی محسوس نہیں ہوتی۔

زائد حقیقت نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اشیا پر یہ لاحق ہونے والا امر نہیں ہے کہ ایک چیز ہے اور زمانہ اس پر لاحق ہو گیا۔ ایسا ہر خیال اور اس کی ہر تمثیل گمراہ کن ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ خیال آرائی کہ فلاں شے ہے اس نے زمانہ میں سفر کرنا شروع کیا، اپنا زمانہ طے کیا اور پھر وہ زمانہ سے نکل گئی یا ماورائے زمانہ ہو گئی محض ایک بے بنیاد مغالطہ ہے۔

زمانہ بذاتِ خود اشیا کا لابدی و ناگزیر پہلو ہوا کرتا ہے۔ اس لیے وہ کبھی ان کے وجود سے زائد امر نہیں ہوا کرتا، چنانچہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اشیائے موجودہ کا ادراک یا مراقبہ اس سے صرفِ نظر کر کے کیا جا سکے۔ افلاطونیت میں بہت سی خوبیوں اور لطافتوں کے باوجود یہی بات تو وحدانِ حقیقت کے نقطۂ نظر سے بصیرت سے تہی تھی کہ اس میں انسان کا تصور تو ہے مگر زمانہ سے معریٰ۔ اسی طرح حمار کا تصور بھی ہے مگر لازمانی۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس سے تصویر تو بن سکتی ہے مگر حقیقی انسان اور اصلی حمار کا ادراک ممکن نہیں۔ افلاطونیت میں ہر زمانی شے موجود مگر ایسی کہ اس میں زمانہ موجود نہیں تب یہ محض ایک تصویروں کا کشیش محل ہی بن سکتی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ زمانہ سے مجرد کر کے کسی ٹھوس حقیقی شے کا ادراک ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ

زمانہ اشیا کے عین وجود کا ناگزیر عنصر ہے۔ اشیا سے بلند مدارج پر جائیں تب بھی یہ اعتراض صحیح ہے۔ مثلاً مدینۃ الفاضلہ، عدل و انصاف، اور آگے بڑھیے "تناسب"، آہنگ اور حسن ان کا بھی کوئی لازمانی وجود نہیں ہوتا۔ اسی طرح ماورائے زمان قانون و دستور اور شریعت لازمان بھی بے معنی تصور ہیں۔ صدیوں مفکرین افلاطونیت کے پھیر میں ان ماورائے زمان تصورات کو بامعنی بنانے میں مصروف رہے مگر لاحاصل۔ بغیر تعین زمانی یہ ہمیشہ بے معنی ہی رہے۔

زمانہ کی یہ اہمیت زمانہ کے حقیقتاً موجود ہونے کا احساس دلاتی ہے چنانچہ یہ موجود ہے مگر اس طرح موجود ہے کہ خود اشیائے زمانہ اس سے متصف ہوتی ہیں۔ چنانچہ خود زمانہ ان کا ناگزیر حصہ ہوتا ہے۔ اس طرح زمانہ کوئی خارجی اور زائد چیز نہیں ٹھہرتا بلکہ خود ماہیتِ اشیا میں شامل حقیقت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر مقرون شئے اپنے مقرون زمانہ سے متصف ہوتی ہے۔ صرف وہ اور وہی مقرون زمانہ اس شئے کے مقرون میں شامل ہوتا ہے کوئی اور ساعت یا لمحہ زماں نہیں اسی بنیاد پر کہہ سکتے تمام زمانہ یا زمان مقرون کی تشکیل ہوتی ہے۔

جب زمانہ کو توارث محض کی صورت معری کے طور پر دیکھا جاتا ہے، جیسا کہ کانٹ نے دیکھا کہ یہ آنے جانے والی اشیا کے لامتناہی سلسلۂ سلف و خلف کا محض ہیکل ہے تو یہ ایک بے معنی ہنگامہ پر دال ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ پیہم ایک موج ابھرتی اور دوسری ڈوبتی ہے۔ اس کے آگے پیچھے اندر باہر سوائے اس کے خود ہونے کے اور کوئی مفہوم نہیں۔ زمین اپنے جوبن پر آتی ہے ہر طرف بہار ہے، اس کے بعد خزاں کا چلن ہے پھر ہر طرف مٹی دھول اٹھنے لگتی ہے۔ ایک بار پھر زمین بہار پر آتی ہے اور یہ بہار بھی گئی۔ لگاتار ایسا ہی ہوتا رہے۔ یہ صورت عارضی ہو یا دائمی سب بے معنی۔ سوائے اس کے ہونے کے اس کے اندر کیا دھرا ہے۔ ایک تھکا دینے والا توارث و تعاقب۔ کیا یہی تاریخ ہے اور اس کے اندر توارث و تعاقب کی صورت معری تاریخیت ہے؟

اگر اس کا جواب ہاں ہے تو اس کے لیے ایک ایسی نظر خوگر تماشا درکار جو اس کے ادلتے بدلتے رنگوں سے کبھی سیر نہ ہو اور ایسی بے لوث نظر فنکارانہ ہوتی ہے ایک آرٹسٹک شہود۔ یہی وہ مشاہدہ ہے جس کو اسوالڈ اشپنگلر نے تمام تاریخ نگاری اور ادراک واقعات کی جان قرار دیا ہے۔ اس دریافت پر ہم حرف گیری نہیں کرتے نہ اس کی قدر و قیمت کا حساب لگانے سے دلچسپی لینا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم اس کی وجودیاتی تفسیر کی طرف متوجہ ہیں۔

تعاقب و توارث، اعادہ اور تکرار کے اس سارے سلسلہ کو قدیم ہندوستانی ثقافت نے

بھگوان کی لیلا (لی لا) قرار دیا ہے۔ لیلا کا قریب ترین مفہوم لفظ کھیل سے ادا ہوتا ہے۔ کھیل میں سوائے کھیل کے کچھ نہیں ہوتا۔ بھگوان نت نیا کھیل دکھاتے ہیں۔ ہر بار نیا رنگ نیا ڈھنگ، ہر وقت کا نیا اکھاڑا اس کا اپنا سُر تال۔ یہی بھگوان کی لیلا ہے اور یہی تاریخ و تار تخلیق ہے۔ نہ اس کے پیچھے کچھ، نہ اس کے آگے کچھ، نہ اس کے بھیتر کچھ۔

بھگوان کی لیلا کا یہ تصور کچھ ہندی ثقافت تک ہی محدود نہیں رہا۔ مسلم ثقافت میں بھی اس نے ایک مخصوص مزاج اور کردار کی تشکیل میں خاصا حصہ لیا۔ ''تجلیات نو بنو کا عالم''، 'ہر دم تازہ ہے شانِ وجود' یہ تصورات اسی لیلا کے ہیکل وجود کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان سب سے لطف اندوزی کے لیے ذوقِ نظر کی ضرورت ہے۔ ایک فنکارانہ مزاج ایک جمالیاتی حِس جس کو اشپنگلر نے ادراکِ تاریخ کا جوہر قرار دیا۔

یہ وہ حِس یا فنکارانہ نگاہ ہے جو اس کھیل سے تکان اور بیزارگی میں مبتلا نہ ہو۔ پھر اس کا مزاج ایسا ہو کہ اس سارے کھیل کے اندر کسی اور مطلب سے جھانکنے کی کوشش نہ کرے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ کھیل ہے اور کھیل کے اندر سوائے کھیل کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی ہر ظاہریت ہی اس کی اصل حقیقت ہے۔ ایک بساط کا جمنا اور پھر اس کا الٹنا، ایک کھیل کے بعد دوسرا کھیل ایک ناٹک کے بعد دوسرا، یہ سب کچھ جمالیاتی منظر ہی تو ہے۔ ایک آرٹسٹ کی نگاہ ہی مورخ بن کر اس کو قلمبند کر سکتی ہے۔ سارا اسنسار ہی کھیل ہے اور کھیل یا لیلا کے وجود یاتی مقولہ (کیٹیگری) کے تحت ہی اس کا بھرپور وجدان و ادراک کیا جا سکتا ہے۔ اسی کو بے لوث نگاہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

بہت زیادہ دور کی جو کوڑی لائے تاریخ میں انھوں نے تکرار تجلیات کا وجدان کیا گویا کھیل کے ایک دورانیہ کے ختم ہونے کے بعد دوسرا دورانیہ جس میں منزل بہ منزل وہی کچھ ہوتا ہے جو پہلے ہوا۔ وہ لوگ جنھوں نے اس قسم کی باتیں کیں دانشور کہلائے۔ فلسفۂ تاریخ کے رازدانوں میں ان کا شمار ہوا۔ ابن خلدون کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہے اور اشپنگلر کا بھی۔ البتہ کچھ ایسے بھی ہوئے جنھوں نے یہ کہا کہ اعادہ و تکرار محض التباس ہے۔ ہر کھیل بالکل ہی نیا کھیل ہے۔ ہر بساط جو بھی اس کے خاکے مہرے نقشے تیور اور رکھ رکھاؤ سب بے نظیر ہوتے۔

اختلافات کے باوجود ان سارے نظریات میں جو قدر مشترک ہے وہ یہی لیلا کا ہیکل ہے یوں تمام تاریخ کی مابعد الطبیعیات کھیل کے تصور میں ہی تمام ہو جاتی ہے۔ کھیل کا ہر واقعہ یا

ہی ہوتا ہے اور کھیل کا حصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ کھیل کے سب اجزا ہی اس کھیل کی ساری حقیقت ہوتے ہیں۔ آپس کے جوڑ توڑ، پلٹنا، الٹنا، مل لوٹنا، بھاؤ، نرت، ڈھنگ اور قاعدے۔ سارا کھیل سب کچھ ان ہی باتوں پر مشتمل ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کھیل کا تمام حاصل سارا لطف خود کھیل کے اندر ہوتا ہے۔ یہ حاصل یا لطف اس کا روحانی پہلو ہے۔ تمام نظریاتی موشگافیاں اسی حاصل اور لطف پر اختتام پذیر ہوتی ہیں۔ یہ تمام ماورائیت کا استرداد ہے۔ کھیل اپنی تمام ماہیت میں اسی استرداد پر مشتمل ہوتا ہے۔

اگر تمام تاریخ کھیل کی تمثیل بر زمان حقیقی ہے تو اس کے کسی واقعہ کے پس پردہ مزید کوئی حقیقت نہیں۔ تمام واقعات گزراں، زمانِ حادث، تجلیاتِ نو بنو، پیہم بدلتی جلوہ سامانی محض ایک سطحی پھیلاؤ ہے۔ یہ گویا زمان کی حقیقت پر امتدادیت کے تصور کا اطلاق ہے۔ چنانچہ اپنی ماہیت میں لیلا کا ہیکل صرف ایک امتدادی مقولہ ہے جس نے مکانی پھیلاؤ کی بجائے زمانی پھیلاؤ کی شکل اختیار کر لی ہے اور زمانی بھی صرف اس معنی میں کہ ایک شو (نظارگی) کے بعد دوسرا شو (نظارگی)۔ ہر شے کے زمانی رخ کا مطلب اس میں بس اتنا ہی ہوا کہ وہ گزر جانے والی ہے۔ المختصر کسی شے کی ماہیت میں زمانہ کا عنصر ہونے کا مفہوم اس فلسفہ میں اس شے کے گزر جانے سے پورا ہو جاتا ہے۔ لیلا یا کھیل کے ہیکل کی ان مضمرات کی توضیح کے بعد ان سے وابستہ تصور تماشا کا بھی تجزیہ ضروری ہو جاتا ہے۔

کچھ تو وہ لوگ ہیں جو کھیل میں شریک ہیں۔ دوسرے وہ جو اس میں شریک نہیں مگر اس کو دیکھتے ہیں۔ یہ تماشابین ہیں۔ یہ کھیل ان کے لیے محض ایک تماشا ہے کسی یونانی دانشور نے کہا تھا کہ یہ تماشابین ہی بہتر لوگ ہیں۔ بہت سے عارفانہ مسلکوں کو دیکھا جائے تو اسی تصور پر مبنی ہیں۔ "سکر" کا مطلب ان کے ہاں اس تماشا میں گم ہو جانا ہے اور "صحو" کا مطلب اس تماشا سے ہوشیار ہو کر تماشا دکھانے والے تک پہنچنا ہے۔ پھر سکر کی بھی اس حساب سے دو قسمیں ٹھہریں۔ ایک تو وہ جو تماشا میں گم ہو گیا اور دوسرا وہ جو تماشا دکھانے والے میں گم ہو گیا۔ اسی طرح صحو بھی ہے۔ تماشا سے ہوشیار تماشا والے کی طرف متوجہ اور دوسرا اس سے بلند وہ صحو جو خود تماشا والے میں گم ہو کر اس کو پا بھی لے اور پھر ہوشیار رہے۔ دیکھا جائے تو عارفانہ مسالک کی یہ قسمیں کوئی بھی لیلا یا کھیل کے ہیکل سے باہر نہیں۔ اسی لیے ان کا اخلاقی جوہر ان ہی کے ہم جنس تسلیم و رضا کے تصور پر استوار ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ

میں یہ امتدادیت ہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں جس نے عرفان کا روپ دھار لیا ہے جو جلوہ نظر آئے سرِ تسلیم خم جو کھیل ہو اس سے راضی۔

اس امتدادیت میں زماں کے جس پہلو میں خود زماں کا سارا مفہوم پورا ہو جاتا ہے۔ (شئے زمانی کے مفہوم کی طرح) وہ گزر جائے یا گزران سے پورا ہو جاتا ہے۔ زمان کو اسی مفہوم تک محدود کرنا ان مذکورہ بالا مسالک میں امرِ خاص ہوتا ہے جو خود لیلا یا کھیل یا تماشا کے بنیادی عناصر میں سے ہے اسی تصور کو ہم نے زمان کے امتدادی نظریہ کا نام دیا ہے۔ یہ امتدادیت بہت سے التباسات میں چھپ بھی سکتی ہے۔ مگر التباسات محض فریبِ نظر یا قلب ہوتے ہیں۔

مثلاً بہت سے مؤرخ اس التباس میں غلطاں و پیچاں رہے کہ میلادِ مسیحؑ ہی تمام گردشِ دوران کا مرکز ہے تاکہ ابن اللہ سے یہ کارخانۂ عالم روشن ہو۔ اس نظریہ کی نفی یا مقابلہ میں اور بھی لوگوں نے دعوے کیے۔ مثلاً اسرائیل اور بنی اسرائیل ہی سارے لیل و نہار کا حاصل ہیں گردشِ ایام ان کے لیے حرکت میں آئی۔ قرونِ وسطیٰ کے یہودی اور عیسائی مؤرخوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کچھ لوگوں نے یہ کہا نہیں سب گردشِ ایام کا مقصود بعثتِ رحمتِ عالمؐ ہے۔ شبلی نعمانی کا سیرت نبوی کی جلد اول میں مشہور انشائیہ اسی ذیل میں آتا ہے۔

مذکورہ بالا طرز کے تمام بیانات محض التباس ہیں، اس لیے کہ زمان کی حرکت میں کوئی ساعت ایسی نہیں جس کے بارے میں یہ دعویٰ نہ کیا جا سکے کہ وہ تمام گزری ساعتوں کا حاصل ہے۔ ہر ساعت تمام ساعاتِ گزشتہ کا مآل ہے اور پھر ہر ساعت کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تمام آنے والی ساعتوں کا وہ مصدر ہے۔ اس طرح سے ہر ساعت تمام ساعتوں کی مرکزی ساعت بن جاتی ہے۔ حاصل اور مطلوب کی یہ منطق صرف فریبِ نظر ہی تو ہے کہنے والا تو یہ کہہ سکتا ہے کہ جنگ پانی پت (۱۷۶۱ء) تمام گردشِ ایام کا مطلوب تھی اور جو آگے ہوا وہ اسی سے ہوا۔ پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آج کے واقعات کی کمیت ہی تمام زماں کا باطن تھی۔ مقصود بالذات تھی اور آنے والے زمانہ میں جو کچھ ہوگا وہ اسی کا ثمر ہے چنانچہ یہی کلیت محورِ زماں ہے، مرکزِ دوراں ہے۔ اس طرح سے امتدادیت مقصدیت کا بہروپ اختیار کر کے آدمیوں کو خوب خوب دھوکوں میں مبتلا کرتی ہے۔ اس سب کی تہہ میں یہی خیال روبہ کار ہے کہ اشیا کی زمانوی حقیقت محض گزر جانے سے عبارت ہے۔ اس میں

مزید ہوتا یہ ہے کہ ذہن انسانی ان میں سے کچھ کو بطور مقصد نشان زد کر کے اپنے لیے معنویت کا ایک پیمانہ تراش لیتا ہے۔ مگر واقعات تحقیقی کی رو میں اس قسم کی معنویت کا مقام صرف وہم انسانی ہے اس سے زیادہ اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ چنانچہ تخیل انسانی کے اس قسم کے سلیے گورکھ دھندوں میں حقیقت منتشر صرف امتداد ہے جس نے زمانی رخ اختیار کر لیا ہے انسانی توہمات کے تراشیدہ بتوں کے انہدام کے بعد یہ محض واقعات کا سیلان یا تجلیات کا سیلاب ہے جو گزراں پذیر ہے اور جس کو لیلا اور صرف لیلا کے خاکے کے اندر ہی دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ یہ وہ بہم واقعات حادث یا گزرتے جلوے ہیں جن کے اول و آخر و درمیان سوائے جلوہ آرائی اور کچھ نہیں۔ کہنے کو کہہ سکتے ہیں "ذوق آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز" ۔ یہی لیلا کے تصور کی جان ہے۔ جلوہ میں جلوہ آرائی کے سوا کچھ نہیں۔ اسی بات کو کھیل کی مابعد الطبیعیات بھی کہا جا سکتا ہے۔ کھیل اپنے اوّل و آخر، ظاہر و باطن، ہویت و ماہیت میں نرا کھیل ہی ہے۔ اسی شاکلت پر تمام لیلا کا مذہب ہے۔ اس کا دیکھنا تماشا ہے اور تماشا میں تماشا کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اس تماشا کا دیکھنے والا وہی جوانمرد ہو سکتا ہے جو بے غرض اور بے مطلب ہو خلوص تماشا بینی اور ذوق تماشا یہ دونوں اس کی عالمانہ شرط ہیں۔ یہ کلام بہت سے حکمائے تاریخ بشمول اشپنگلر، سوروکن اور ٹوئن بی کو پسند آئے گا اور بہت سے اہل دل عارفوں اور صوفیوں کو بھی۔ وجہ یہ ہے کہ ان تمام حضرات کی علمیاتی بنیادیں لیلا کی شاکلت وجودیہ یا ہیکل قوامیہ پر ہی استوار ہیں۔ ان کی اخلاقیات عمل وجہ تسلیم و رضا کی وہ اخلاقیات ہے جو اسی شاکلت و ہیکل سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے ضابطۂ حیات میں زمانہ کے امتدادی وجدان کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر بات نہیں ملتی۔

انوار قرآنیہ سے جس روح اور وجدان کی پرورش ہوتی ہے۔ وہ اس قسم کے خیالات کو بے وزن قرار دیتی ہے۔ ارشاد باری ہے کہ: وما خلقنا السماء والارض وما بینهما لاعبین ۰ لو اردنا ان نتخذ لھوا لاتخذنٰہ من لدنا ان کنا فاعلین ۰ (اور ہم نے نہیں پیدا کیا آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ ہے کھیل کھیل میں۔ اگر ہم چاہتے کہ کوئی کھلونا اختیار کریں تو ہم اپنے پاس سے اختیار کرتے اگر ہمیں یہی کچھ کرنا تھا (سورۂ انبیاء ۲۱: ۱۶-۱۷) مطلب یہ کہ کھیل اور کھلونا ان جناب باری کو چاہیے تھا تو وہ خود اپنے ہاں سے ایسا کرتے

انکی یہ زرش تھی۔ استاندڑا گور کھ دھندا کھڑا کرتے تمام خلقت دم بدم کے تغیرات، رات کا دن میں اور دن کا رات میں داخل ہونا، بے جان میں سے جان کا ظہور اور جان میں سے بے جان کی نمود، وقت وقت کی یہ کروٹ، یہ روز مرہ کا الٹ پلٹ یہ کوئی سوانگ یا ناٹک نہیں ہے اس پر اچھی طرح غور کرے تو خود آدمی پکار اٹھے ماخلقت ھذا باطلا (سورہ ۳: ۱۹۱) اس وجدان کے مطابق بھگوان کوئی کلاکار نہیں ہیں کہ بس ترنگ میں آکر اپنے نرت اور بھاؤ دکھاتے ہیں حالات کا اتار چڑھاؤ، آمد بہار، ہر آن سبزہ و باغ، پھر آمد خزاں، پت جھڑ، ہر طرف سوکھے کا راج اور خاک کا اڑنا، یہ تکرارِ تجلیات ایک کے بعد دوسری بساط کا بسنا اور الٹنا یہ کوئی تماشا نہیں بھگوان نے کوئی ناٹک نہیں رچایا کہ باطل اس کا مقام ٹھہرے۔

وہ لوگ جو اس کو کھیل کود، کلا اور تماشا قرار دیتے ہیں اور اس کے بیچ میں خود بھی کھیل دکھانے اترنے ہیں بہت بڑے غرور میں مبتلا ہیں اور یہ غرور ہی ان کو لے ڈوبتا ہے۔ غرور یعنی دھوکہ کی اس زندگی کو قرآن حکیم نے حیات الدین سے تعبیر کیا ہے۔

"وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ (اور حیات الدنیا لھو ولعب یعنی کھلونے اور کھیل کے سوا کیا ہے" (سورہ عنکبوت ۲۹: ۶۴) "اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ (بے شک حیات الدنیا کھیل اور کھلونا ہے (سورہ محمد ۴۷: ۳۶)"۔ "وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (اور کیا ہے حیات الدنیا دھوکے کی پونجی کے سوا (آل عمران ۳: ۱۸)"

حیات الدنیا جو دھوکا کی پونجی ہے وہ بہت ہی اوپری سی نگاہ ہے جو آس پاس آمنے سامنے کی سطحی باتوں میں کھو جاتی ہے۔ دنیا کہتے ہیں نزدیک کی باتوں اور نظاروں کو جو دل اور نگاہ اس پر ریجھ گئی اس میں نہ تو کوئی گیرائی پائی جاتی ہے نہ دور اندیشی اور نہ ہی خیر اندیشی۔ اس کا حاصل دھوکوں کی جمع بندی ہے۔

جب یہ بھگوان کی لیلا بطور مشاہدہ میں آتی ہے تو اس میں دیکھنے والوں کا کام صرف تماشا دیکھنا ہے جیسا کہ اوپر گزرا۔ یہ گیانیوں عارفوں کا ایک بڑا وطیرہ ہے۔

مگر جب یہ بھگوان سے صرف نظر کرکے صرف لیلا ہی لیلا یعنی کھیل ہی کھیل نظر آئے تو پھر اس میں سب کھلاڑی بن جاتے ہیں۔ ہر ایک اپنا کھیل دکھاتا ہے۔ اس سارے کھیل میں جو بازیاں ہماری گرفت سے باہر رہ جاتی ہیں وہ قسمت نصیب یا پھر بھگوان کی اِچھا (مشیت ربانی)

کہلاتی ہیں اور جو بازیاں اپنی گرفت میں آگئیں وہ اپنی دانائی، حاصل و کمال خیال کی جاتی ہیں۔ جو لوگ اس میں مرہ کر ذرا اس سے کچھ الگ تھلگ سے ہوتے ہیں، ان کو یہ سب بقول غالب یوں دکھائی دیتا ہے: بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اطفال (بالکوں اور بچوں) کے لیے ہر آن کھیل کود کا سمے ہے۔ اس کی سمائیوں میں سوائے گلچھرے اڑانے اور بازی لگانے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس کو پچھاڑا، اس کو جا لیا۔ فلاں رن آؤٹ ہو گیا۔ ہم نے اتنے گول کیے۔ پچھلی دفعہ پٹ گئے تھے۔ اب کی مرتبہ تو جیت گئے۔ ہر سمان یوں ہی بیتتا جائے۔ کیا چھوٹے کیا بڑے سب یوں ہی تو بے پناہ مشغول و مصروف ہیں۔ ان کے ہاں زندگی کی یہی منطق ہے اور زمان کا یہی سلسلہ ہے کہ سمے بعد سما گزرتا جائے۔ ایک ساعت کے بعد دوسری ساعت آئی چلی۔ زمانہ میں اس کے سوا کیا دھرا ہے؟

ان کو کیا خبر کہ ان ساعتوں کے بعد اور ساعتیں بھی آنے والی ہیں جو ان کے ہوش اڑا دیں گی جن کو دیکھ کر ان کے انجر پنجر ڈھیلے پڑ جائیں گے۔ وہ تھم زمانہ کو ایک سپاٹ بھاؤ جانتے تھے جس کا گزران کبھی دھیما اور کبھی تیز ہو جاتا تھا۔ اس پورے بھاؤ میں جو موجوں کے زیر و بم یکسانیت، اعادہ و تکرار کے زمرے تلاش میں آجاتے تھے وہ قوانین زمانہ قرار پائے اور ان کی اپنی بازیوں کے قواعد و ضوابط بن جاتے تھے۔ زمانہ کے تغیر و تبدل کی احوال شناسیوں کی انھوں نے اس سے زیادہ قدر نہیں کی کہ ان کے ذریعہ وہ اپنی بازیوں کی کاٹ میں اضافہ کر لیتے تھے۔

الموجود اور اس کی ہیئت زمان کی اپنی ساخت میں "بازیچۂ اطفال" ہونے کا یہ تصور حیات، اسی کو حیات الدنیا کہتے ہیں، جس کو قرآن حکیم نے بہت ہی جامع خلاصہ کے طور پر یوں گویا شہ سرخیوں کے ساتھ مشائع فرمایا ہے۔

"اور جان رکھو کھیل تماشہ، بناؤ سنگھار، اور ایک دوسرے کے سامنے اتراہٹ اور اموال و اولاد میں ایک دوسرے پر بڑھاوا..... اور کیا ہے حیات الدنیا سوائے دھوکہ کی پونجی کے (الحدید ۵۷ : ۲۰)

"سجیلی گئی آدمیوں کو محبت خواہشات کی، عورتوں (کی خواہش) اولاد (کی خواہش)،

سونے چاندی کے ڈھیروں (کی خواہش)، نشان زدہ گھوڑوں، مویشیوں اور پیداوار (کی خواہش) یہ سب جمع جتھا ہے۔ حیات الدنیا کا، مگر جو اللہ کے پاس ہے وہ اس سب سے بہتر ہے (آل عمران ۳: ۱۴)"

حیات الدنیا کا بنیادی ہیکل یہی " لہو و لعب " یا " لعب و لہو " کا ہیکل ہے۔ ہم نے محاورۃً کھیل تماشا کہا ہے مگر لہو اصلاً اس ساز و سامان کو کہتے ہیں جو صرف کھیل کے کام آتا ہے اور اس کو عرف عام میں کھلونا کہا جا سکتا ہے۔ لفظ کھیل یا لعب میں فعلی پہلو نمایاں ہے جبکہ لہو میں اثاثہ کا رخ نمایاں ہے۔ لہو و لعب کی زندگی کھیل یا کھیل کے اثاثوں پر ہی مشتمل ہے اور یہ سب کا سب تماشا ہے اور بس۔ قرآن حکیم میں حیات الدنیا کے اس بنیادی ہیکل کو نمایاں کر کے آیات کے باقی حصوں میں جن باتوں کا ذکر ہے وہ امور زائدہ نہیں ہیں بلکہ امور تشریحی ہیں۔ اموال کے لگاتار کی خواہش، ایک دوسرے سے نمود میں بڑھ جانا اور مات دینے کی خواہش، سب جمع جتھا سب کا سب لہو و لعب ہے۔ حیات الدنیا یہ ہے کہ اس میں ہر موسم واقعات ایک نیا موقع فراہم کرتی ہے کہ ہاں ایک بازی اور، دوسروں سے جمع جتھا نمود و نمائش میں آگے بڑھ جانا ہے۔ تمام بدلتی رتوں میں، زمانہ کے تغیرات، حالات کے الٹ پلٹ میں آدمی بس ایسے موقعوں کے لیے سرگرداں نظر آتے ہیں، خون پسینا ایک کرتے ہیں بھاگے جا رہے ہیں۔ شان و شوکت میں چیزوں پر قبضہ جمانے میں کتبہ و کنبہ کو ادھار کر لے میں ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر یہی سب کچھ ہے تو قرآن حکیم کے مطابق یہ سب کا سب محض باطل ہے۔ اگر زمانہ کی یہی منطق ہے کہ یہ گزران محض ہے اس کے جملہ اسباب و علل اسی گزران محض کا حصہ ہیں، اگر ہر چیز گزر جانے والی ہے تو پھر یہ سب کھیل تماشا اور جو کچھ اس میں ہے کھیل تماشا کا سامان ہی ہوا، پورا کا پورا حیات الدنیا۔

لیکن گزرتی ہوئی تمام ساعتوں میں آن حاضر کا احساس اور وجدان، زمانہ کی اس ماہیت اور اس کے متجانس حیات الدنیا کے ہیکل کی مکمل نفی کرتا ہے۔ آن حاضر کے بارے میں یہ حکم کہ یہ تو ایک منہاج علم اور صورت ادراک ہے۔ زمانہ کا علم جب بھی ہوتا ہے آن حاضر بطور ہوتا ہے ورنہ وجود "زمانہ سیلان پذیر گزراں آمادہ ہے" یہ ایک سطحی انداز فکر ہے اگر وقوف زماں کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا گزران بھی ادراک میں آ جاتا ہے۔ جبکہ

آنِ حاضر ایک مدام تجربہ ہے۔ وجوداً یہ خود زمانہ کی ماہیت میں داخل ہے اور اس طرح داخل ہے کہ زمانِ گزراں کی تمام آنات ——— ماضی حال و مستقبل کی آنات ——— سے مختلف ہے۔ یہ آنِ حال سے بھی منفرد ہے۔ آنِ حال تو آناتِ ما قبل و آناتِ مستقبلہ کی ہم جنس ہے۔ آنِ حاضر یوں منفرد ہے کہ یہ آن سیال بھی ہے۔ تمام ماضی و مستقبل کے گزران میں دائماً موجود رہے۔ چنانچہ اس کی ہویت ایسی نہیں کہ کسی اور آن کی طرح رفت گزشت ہو جائے بلکہ ایسی ہے کہ ہر آنِ رفت گزشت کے ساتھ موجود ہے۔ اگر لوگ صرف اتنی سی بات پر غور کرتے تو سنسار محض واقعاتِ گزراں اور نئی ساعتوں کی پیہم آمد و رفت کا کھیل تماشا نظر نہ آتا۔

آنِ حاضر کی وسعتوں کا اندازہ کرنا ہو تو خود اپنی آنِ حاضر کے باطن میں جھانکیے اس میں آپ کا سارا گزرا زمانہ غلطاں و پیچاں نظر آنے لگا۔ یہ آپ کے اپنے وجود کا تار و پود جس پر آپ نے باطن سے نگاہ کی ہے اور اگر ظاہر سے نگاہ ڈالیں تو یہی آپ کا قد و قامت اور شخصیت ہے۔ کسی شے مثلاً کرۂ ارض کی آنِ حاضر کو اندر سے کھنگالا جائے تو اس کا تمام ماضی اور اس کے تمام بیتے جگ آنکھوں کے سامنے گھوم جائیں۔ اسی کلیہ پر آثاریات کا علم مرتب ہوتا ہے آفرینشِ کائنات سے لے کر اب تک کی تمام سرگزشت اس کی اسی آنِ حاضر کے دفینوں سے مرتب کی جا سکتی ہے گو یہ دوسری بات ہے کہ اس باب میں علم کی ہر شاخ کی اپنی اپنی فنیات ہوتی ہے۔

اس قسم کی باتوں سے متاثر ہو کر بعض شیوخ مؤرخین نے یہ دعویٰ کیا کہ مطالعۂ تاریخ دراصل حال کا مطالعہ ہے اور حال تک پہنچنے کے لیے اس کے ماضی تک جانا ضروری ہے اور یہ صرف حال کی کھدائی کے ذریعہ ممکن ہے۔ یہ بات صحیح نہیں۔ اس لیے کہ طریقیات کے اعتبار سے مؤرخین ماضی سے حال کی طرف چلتے ہیں نہ کہ حال سے ماضی کی طرف۔ تاریخ ہمیشہ ماضی بعید سے ماضی قریب تک کے سفر پر مشتمل ہوتی ہے اب ہم اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں جس میں بنیادی بات یہ ہے کہ آنِ حاضر تمام گزراں زماں میں ہمہ وقت حاضر رہتی ہے اسی لیے یہ آنِ دائم بھی ہے۔

زمانہ کے آنات کے بارے میں ہم یہ کہیں پہلے واضح کر چکے ہیں کہ اگرچہ یہ باہم ہم جنس معلوم ہوتی ہیں مگر ہر آن وجوداً ایسی بے مثل ہوتی ہے کہ نہ تو اپنے وقت سے پہلے رہ آ سکتی ہے نہ اپنے وقت کے بعد۔ سلسلہ آنات یعنی زمانِ حادث میں ہر آن اور ہر حادثہ اپنے

ذاتی اور منفرد مقام پر ہوتا ہے۔ اس طرح زمانہ کے پھیرسے لوٹ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہر آن گزراں اپنی نمود سے آن حاضر میں کسی نہ کسی طور بار یابی لیتی اور اس کے "اعظم جسد" کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس طرح ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ آن حاضر تمام آنات کی ایک مخصوص شیرازہ بندی ہے۔ یہ تمام گزری ساعتیں جو آن حاضر میں مجتمع نظر آتی ہیں۔ ان سے تاریخی جبریت کے مختلف مسلکوں کو ترغیب ملتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ یوں کہ ماضی ہمیشہ تعاقب میں آتا نظر آتا ہے۔ لگتا ہے اگرچہ ماضی اس کی ... ہے باہر نہیں، ہر آنے والی ساعت پر اپنا پھندا پھینکتا ہے اور اس کو اپنا اسیر بنا لیتا ہے ... یہ تاریخی جبریت (کا مسلک) ہے جس کے مطابق ہر آنی وہ ہے جو اس کا ماضی ہے۔ اور یہی اس کا مستقبل بھی ہے۔ دیکھا جائے تو اصول دہریت یہی ہے جس کے مطابق تمام زمانہ ماضی کا اسیر ہے اور اسی کے پاس سارا مستقبل رہن ہے۔ ماضی اگر فنا پذیر ہے تو حال اسی ماضی کا زلہ ہے۔ توجہات اور رسمات کا یہ دستور زمانہ کی حکایت ہے۔ یہ حرکیت اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس طرح اصول دہریت اپنی روایات نو بہ نو کے ساتھ ماضی اور ماضی پرستی میں ڈھل جاتا ہے یعنی جو اول تھا وہ آخر میں بھی ہے اور وہ درمیان میں بھی ہے۔

ابھی انسانوں نے تاریخ رقم کرنے کا گر بھی نہ جانا تھا تو ان کی بستیوں میں اصول دہریت نے قریب قریب سب افکار و خیالات پر پورا پورا غلبہ حاصل کر لیا۔ یہاں تک کہ یہ اصول سب بڑی بڑی تہذیبوں کا مرکزہ بن گیا جس طرح ہر آنے والی ساعت پچھلی ساعت کا نقش مکرر ہے (اور یہی دہریت ہے) اسی طرح ہر آنے والی نسل پچھلی کا نقش ثانی ہے۔ اگر زمین پر آمون رعا (خداوند زمین و آسمان کا مصری نام) کے فرزند کی حکومت ہے تو اس کی وفات کے بعد جو اس کا بیٹا تخت فرعون پر بیٹھا وہ بھی نقش مکرر یا آمون رعا کا فرزند ہے کلدانیا میں جو دھرتی کا پالن ہار ہوا وہ آشور دیوی کا فرزند تھا۔ چنانچہ ہر نمرود کے بعد جو دوسرا نمرود مولود ہوا تو وہ نمرود بھی آشور دیوی کا فرزند ہی تھا۔ آنے والی ہر ساعت میں اسی فرزند کی نمود ہوتی۔ ہر آنے والا دیوتا جہان کا نیا چہرہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سب جگہ اسی انداز میں شجرے مرتب کیے جانے لگے۔ جنھوں نے خداوند قمر کی نسل سے ہونے کا دعوی کیا تو اس دعوے سے ان کی مراد یہی تھی کہ یہ اسی خداوند کا سنت ہے جو نسل در نسل مختلف ادعاؤں

سے گزرتا ہوا ان کی ذات میں نمودار ہوا ہے اور یوں وہ اپنے مورثِ اعلیٰ خداوند کے فرزندِ اول کی طرح اشرف و اکبر ہیں۔ سورج دیوتا (یا دیوی) کی نسل کا بھی اسی طرح اعلیٰ مقام ہے۔ یوں انسانی تمدنوں میں اعلیٰ نسب کے خاندانوں کا غلغلہ ہوا۔ اس کے بعد کے درجے کے لوگ گویا وہ تھے جو ان خداؤں اور دیوتاؤں کے مقربین کی ست سے تھے۔ ہر نسل میں وہی موروثی ست ہے اور اسی ست کی بنا پر اپنی گزری نسلوں کی پیڑھی کی طرح وہ اسی مقام کے بلاشک و شبہ مستحق ہیں جو ان کے پرکھوں کا تھا۔ پھر یہ عوام کا انام ہیں وہ تو دیوتاؤں اور ان کے مقربوں کے نوکروں چاکروں کی ست سے ہیں۔ لایزال وہ اسی مقام کے مستحق ہیں۔

جب عہدِ قدیم کی تہذیبوں کے بعد خیالات میں کچھ اور لطافت و آفاقیت پیدا ہوئی تو امورِ مزدہ (خداوندِ نور) کا خیال مختلف تمدنوں میں پھیلنے لگا۔ چنانچہ عدم کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جس نور نے طلوع ہو کر چار سُو اجالا کر دیا ـــــ یہ ان کی تشریحِ کائنات تھی جس نے مجوسیت، یہودیت، نصرانیت اور مابعد پھر کچھ اہلِ اسلام کو بھی متاثر کیا ـــــ تو اس نورِ اول سے نور نامے مرتب ہوئے۔ بعض یوں دعویدار ہوئے کہ ہمارا موروثی ست وہی نور ہے جو باعثِ تخلیقِ کائنات ہے۔ وہ نسل بعد نسل اصلاب سے گزر کر ارحام میں پرورش پاتا ہوا ہمارے ایک جد کے بعد دوسرے جد کی صورت میں نمودار ہوتا ہوا آخر کار اب ہم میں نمودار ہوا ہے۔ ہمارے اول میں جو نور تھا وہی ہمارا جوہرِ ذات ہے۔ پس ساری کائنات کا فرض ہے کہ وہ ہمیں سجدہ کرے۔ کیا لوگ نہیں جانتے کہ ملائکہ نے جب آدم کو سجدہ کیا تھا تو دراصل انھوں نے اسی نور کو سجدہ کیا تھا اس لیے تمام جہاں پر واجب ہے کہ واصل بحق ہونے کے لیے ہمارا وسیلہ اختیار کرے اور اگر وہ اپنی فلاح چاہے تو پھر اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ ہمیں اپنے صدر میں جگہ دے۔ ہمارا گرا پڑا مفلس بھی اس مرتبہ کا حامل ہے کہ بڑی تعظیم کے ساتھ اس کی خدمت میں نذرانہ پیش کیا جائے کیونکہ اس کا جوہر و ست خیرات و صدقات سے کہیں بلند و بالا ہے۔ یہ تو خود لوگوں کی خوش بختی ہے کہ ان کا نذرانہ ہمارے کسی مسکین کے ہاں شرفِ قبولیت سے آشنا ہوا۔ اشکبار کے یہ دعوے اصولِ دہریت کی ہی مختلف شکلیں ہیں کہ جو اول تھا وہی ہر درمیان میں تھا اور وہی آخر میں ہے نسب نامے اسی ایک ہی کا اعادہ مسلسل ہیں جو اول تھا اور وقت کی ہر ساعت بھی اسی ساعتِ اول کی تکرارِ مسلسل ہے جو اول تھی۔

اسلام دہریت اور اس سے پیدا شدہ غثر غمائے خرافات کے خلاف روحانی، ذہنی اور

عملی انقلاب ہے۔ دہریت کے خلاف یہ مکمل انقلاب یوں ہے کہ زمانہ کی حرکیت میں تکرارِ ساعات کی بجائے لمحاتِ جدیدہ کی نمود اس کے ادراک اور وجدان کا حصہ ہے اور اسی کے مطابق اس کا حیاتیاتی زمان بھی ہے جو ایک نسل کے بعد دوسری نسل کی نمود کی صورت میں حرکت پذیر ہے اور اس طرح حرکت پذیر ہے کہ ہر آنے والی نسل پچھلی نسل سے اپنے سمت میں مختلف ہوتی ہے۔ ہم اسی نکتہ کی تشریح کریں گے اور اس تشریح سے خود زمان پر بھی روشنی پڑے گی۔

اسلام سے پہلے جو مشرکانہ تہذیبیں تھیں اور ان سے متاثر جو دوسری ثقافتیں تھیں انھوں نے اپنے صدر میں اصولِ نرینہ کو جگہ دی۔ اسلام نے اس کے برخلاف تمام رشتوں کی بنیاد "رحم" کو قرار دیا اور قرابت داری میں "ذوارحام" کے تصور کو عام کیا۔ جس سے عالمِ نسواں کا مزید کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ اور پھر تعینِ نسل میں اس نے اعادۂ مرت۔ یا تکرارِ جوہر (یعنی اصولِ نرینہ) کو مسترد کر کے اصولِ زوجیت کو حقانیت قرار دیا۔ چنانچہ ہر نومولود ایک نیا نقش ہے جس کے جوہرِ ولادت میں اور حیاتیاتی تشخص میں ماں باپ دونوں کو ہر طرح شریک قرار دیا گیا۔ اس خیال کا قرآن حکیم نے جڑ و بنیاد سے ابطال کیا جس پر مشرکانہ تمدنوں کی اساس تھی کہ تخم تو مذکر کا ہوتا ہے جو اس کے صلب سے گزر کر رحمِ مادری میں ایسے ہی پرورش پاتا ہے جیسے بیج آغوشِ زمین میں کہ اس سے صرف تغذیہ حاصل کر کے نمودار ہوتا ہے بہت واضح طور پر قرآن حکیم نے اس تصور کو یہ کہہ کر ختم کیا کہ "اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ" ("ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا" نہ کہ صرف مرد کی تشکیل (نطفہ) سے ۷۶ : ۲)" یہ آیتِ مبارکہ ان شجروں پر پانی پھیر دیتی ہیں جو لوگ اپنی ہمانیوں میں لیے پھرتے ہیں اور جن پر صرف قبل اسلام دورِ جاہلیت کی گمراہی کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

انکشافاتِ الٰہیہ کے مطابق انسانوں کو صرف آدم سے نہیں آدم اور حوا سے پیدا کیا گیا۔ جب کوئی انسان یہ کہتا ہے کہ میں فلاں آدمی کا بیٹا ہوں تو یہ آدھا سچ ہے۔ باقی آدھا سچ یہ ہے کہ وہ فلاں عورت کا بھی بیٹا ہے۔ حیاتیاتی علوم کی تحقیقات و انکشافات بھی اسی الٰہی سچائی کی گواہی دیتی ہیں۔ حیاتیاتی خلیہ (یہاں اکائی انسانی خلیہ مراد ہے) جس کی تکثیر و تقسیم و تنظیم سے حیاتیاتی عضویہ یعنی انسانی نومولود وجود میں آتا ہے۔ اس کے چھیالیس کروموزوم ہوتے ہیں جن میں سے ۲۳ ماں سے اور ۲۳ باپ سے حاصل ہوتے ہیں تب وہ اپنی تقسیم و تکثیر و تنظیم کرتا ہے یہاں تک کہ تمام اندرونی اعضا اور بیرونی جوارح مکمل ہو جاتے ہیں اور پھر پورا ننھا سا انسان زمین پر قدم رکھتا ہے۔ اس کے

تمام اعضا وجوارح، دل، دماغ غرض ہر آلۂ جسم کے تمام خلیوں میں یہی ۲۳، اور ۲۳ کے جوڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح تمام نورنامے اور مستقل ست کے توہمات جھوٹ کا پلندہ بن کر باطل کے اندھیاروں میں گم ہو جاتے ہیں۔

ہر ساعت یا وقت کی ہر اکائی کی طرح ہر فرد انسانی بھی ایک نیا، بالکل نیا نقش ہے یوں کہ اس کی نسبت اپنی ماں اور اپنے باپ سے یکساں یکساں ہے۔ چنانچہ اگر اس کا شجرۂ نسب مرتب کیا جائے تو وہ ہرگز اس طرح نہیں ترقیم میں آئے گا کہ مثلاً احمد بن سعید بن محمود بن حامد بن صادق بن مجید بن بشیر بن مسعود بن سہیل بن نعیم بن کعب بن عذیر۔ شجرۂ نسب کی یہ ترقیم مشرکانہ تہذیبوں کی آثاریات سے بری دہریت کا صنم کدہ ہے جس کو آیاتِ الٰہیہ اور حیاتیاتی علوم پاش پاش کر دیتے ہیں۔ مذکورہ شجرہ میں گیارہ پیڑھیوں تک کا بیان ہے جو پہلی پیڑھی سے ہی سچائی سے ہٹتا چلا گیا ہے۔ احمد اصلاً دو افراد کا بیٹا ہے (ایک مرد ایک عورت) پھر وہ دو افراد چار افراد کے اور وہ چار افراد اپنی باری میں آٹھ افراد کے اور وہ آٹھ سولہ افراد کے۔ گیارہویں پیڑھی میں احمد کا نسبی تعلق بارہ سو اڑتالیس افراد سے قائم ہوتا ہے جبکہ اس کے اپنے جعلی شجرہ میں اس پیڑھی کے صرف ایک فرد (عذیر) کا نام درج ہے۔ جب بات بارہویں پیڑھی تک پہنچتی ہے تو نسبی نسبتوں کا یہ جال پھیل کر اس پیڑھی کے چھتیس سو چھیانوے افراد تک وسیع ہو جاتا ہے۔ گویا آج کے اس احمد کا اب سے تیس سو سال پہلے کے چھتیس سو چھیانوے افراد سے نسبی خونی، نسلی رشتہ ہے۔ وہ بالکل ایک نقشِ نو ہے جس میں ان میں سے کسی کی تکرار نہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ پیڑھیاں یا نسلیں جتنی بعید سے بعید تر ہوں گی نسبی جال اتنا ہی اضعافاً مضاعفاً وسیع و عریض ہوتا چلا جائے گا اور تعلق اس انداز سے ہے کہ آج کے ہر فرد کے تعین میں ماضی بعید سے بعید تر بن نسل کے قریب قریب تمام افراد کا کسی نہ کسی طرح نسبی تعلق ہے۔ حیاتیاتی بالخصوص بشری زماں کی یہی باطنی ماہیت ہے جو ہمارے سامنے یوں ہویدا ہوئی۔ یہی باطنی ماہیت اسلام کے بنیادی عقیدہ مساواتِ انسانی کی ٹھوس بنیاد فراہم کرتی ہے۔

زمانِ مقرون کی بھی عین بعین یہی ماہیت ہے۔ کسی ایک واقعہ کو لیجیے اس کے پس منظر (فوری ماضی) میں ایک سے زیادہ واقعات نظر آئیں گے۔ پھر ان واقعات کے پس منظر میں ایک تعداد نظر آئے گی جتنا ماضی میں ہٹتے جائیں موجودہ واقعہ کی تشریح میں، واقعات کے سلسلوں میں بلکہ ہمعصر واقعات کے جال میں تیزی سے توسیع ہوتی جائے گی یہاں تک کہ ماضی بعید کی کسی ساعت

پرمبنی ٹھیرا جائے تو اس ساعت کے ان گنت واقعات سے اس موجودہ واقعہ کا تاریخی رشتہ جڑتا دکھائی دے گا۔ یہ اس کی تاریخی تشریح ہے اور حال کے ہر واقعہ کی یہی تشریح ہے کہ اس کے حادث ہونے میں ماضی بعید ترین کے سب ہی واقعات علت و معلول یا کون و فساد کے رشتے سے شامل ہیں مگر جملہ تاریخی تشریح کے اس واقعہ کی پھر بھی پوری تشریح نہیں بن سکتی۔ اس لیے کہ ہر وقوعہ میں اپنا ایک ذاتی نیا پن ہوتا ہے جو اس کے ہونے کا لازمہ حصہ ہوتا ہے اور جس کے سبب وہ منفرد واقعہ بطور حادث ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پچھلے کئی واقعات سے وہ مشابہ ہو لیکن اس کے باوجود وہ وہی واقعہ ہے کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔ اسی بات کو اس کی ذاتی یکتائی کہتے ہیں اور اس کی یکتائیت کی تشریح جامع سے جامع تاریخی پس منظر بیان کرنے سے ممکن نہیں صرف اس کی اپنی ذاتی ہویت کے ادراک و احصاء سے اس کی تفہیم مکمل ہوتی ہے۔ اور اسی کی بنیاد پر وہ واقعہ تاریخ کی نئی پیش رفت یا زمان مقرون کا اگلا قدم ٹھیرتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کی توضیح سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ حال کا کوئی واقعہ ایسا نہیں جو ماضی کے زاویوں میں پورے طور پر گھل سکے اور نہ ایسا ہے کہ اس کی پیش بینی ماضی کے حوالے سے کی جاسکے۔ اسی لیے اسلام کے وجدان کے مطابق کوئی ماضی، حال اور مستقبل کا معیار نہیں بن سکتا۔ ہر وہ ادّعا جس میں مستقبل کا معیار ماضی کو قرار دیا گیا خود زماں کے اصول حرکیت کے خلاف ہے اس لیے کفریات کی سب سے بڑی گرادوٹ میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہ گراوٹ زمان کے بہاؤ کا رخ موڑ کر ماضی اور جنم پرستی کے گنبد میں بند کر کے اس کو سڑا دیتی ہے اور سڑا کر مردود کر دیتی ہے۔ یہی دہریت اور اس کی حق سے بیکار کی رجعت ہے جو ہر چیز کو اس کے اندر سے ڈھا کر ویران کر دیتی ہے۔ چنانچہ اسلام نے اس باب میں بار بار تنبیہ کی ہے۔

آیات الٰہیہ میں اس عظیم المرتبت کا بار بار ذکر کیا گیا ہے جو باوجود بہت بڑا عابد ہونے کے اپنے باطن کو ماضی پرستی کے داغ سے پاک نہ کر سکا۔ اور اس دعوٰی کے دھوکے میں مبتلا ہو کر سب کچھ گنوا بیٹھا کہ میں اپنے جنم سے اس سے اعلیٰ و اشرف ہوں جس کو تو نے (یعنی جناب باری تعالیٰ نے) مٹی سے بنایا ہے تمام میلاد پرستوں کے لیے اس داستان اور اس کے بار بار اعادہ میں عبرت اور دہشت پکڑنے کا سامان ہے۔ اس کی تمام سیاحت، زہد و عبادت اس کے دل کی اس تاریکی کو دور نہ کر سکی جو جنم پرستی اور ماضی کی پوجا سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جو خود اس کے مستقبل کی راہ میں خود اس کے لیے سنگِ گراں بن گئی وہ گر گیا اور اس جہان میں بھٹکنے والی اور بھٹکانے والی

بادِ سموم بن گیا۔ اس نے ماضی پرستی میں گرفتار ہو کر مٹی کے مستقبل کو مٹی میں ہی جانا اور اسی کو برحق کہا مگر اس نے جب دیکھا کہ مٹی کی مورتیوں کا مستقبل کہیں بلند و بالا ہے اور ان کا اعزاز و اکرام اتنا بڑا ہے کہ پائے عرش تک ان کی رسائی ہو سکتی ہے تو یہ بات اس کو ارض و سما میں حق و استحقاق کے تہ و بالا ہونے کے برابر لگی اور اپنا مستقبل تاریک نظر آیا کہ وہ جنابِ باری خلافِ حق و مرتبہ اس کی منزلوں اور مرادوں سے اس کو گم کردہ راہ کرنے کے درپے ہے۔ اس بات نے اوّلاً اس کو ابلیس یعنی انتہائی مایوسی کا پیکر بنا دیا۔ حالانکہ یہ بات نہ تھی۔ جنابِ باری کے بارے میں بدگمانی نے اس کے سارے مقاماتِ عالیہ چھین لیے اور وہ نہ صرف ابلیس بلکہ ابلیس سے شیطان بن گیا۔

یعنی بے حد و حساب سرکشی کرنے لگا جیسا تُو نے مجھے اغوا کیا (یعنی اپنی منزلوں سے بھٹکا دیا) میں بھی اس مٹی کے مادھو اور اس کی ذریات کو اغوا کروں گا۔ بہرحال یہ ابلیسیت و شیطانیت کی داستان جس کو قرآن حکیم میں مختلف سورتوں مثلاً سورہ بقرہ (آیات ۳۴-۳۶) سورہ اعراف (آیات ۱۱-۲۷) سورہ الحجر (آیات ۲۶-۴۲) سورہ طٰہٰ (آیات ۱۱۶-۱۲۴) اور دیگر مقامات میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ بنیادی طور پر دہر پرستی سے وجود میں آتی ہے اسی سے ماضی پرستی اور اپنے جنم کی کشش میں گم گشتگی پیدا ہوتی ہے۔

یہ داستان خود تاریخِ انسانی میں بھی افراد اور اقوام، خاندانوں اور قبیلوں میں اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ جب کبھی خاک نشین طبقات یا اقوام کے مستقبلِ روشن کے امکانات پیدا ہوئے تو بالا نشین طبقات اور اقوام میں کھلبلی مچ گئی ان کو اپنا مستقبل تاریک نظر آیا۔ پس اولاً وہ ابلیس اور پھر شیطان بن گئیں تاکہ خاک نشینوں کو ہر روشنی اور مستقبل سے محروم کر دیں۔ کتنے ہی لوگ اور خانوادے، گروہ اور قبیلے اس خبط میں مبتلا ہوئے کہ ہم اپنے جنم سے اعلیٰ و اشرف اور تمام انسانوں کے حکمران ہیں مگر اپنی بہت سی خوبیوں کے باوصف اپنے بطون میں ابلیس ہی رہے اور شیطانیت ہی ان کے افکار و اعمال کا سرچشمہ رہی۔

قرآن حکیم کی جو روشنی پورے جاہ و جمال کے ساتھ جلوہ گر ہے اور جس کی تجلیات سے پچھلے صحف بھی منور ہیں وہ زمانِ حقیقی کی منطق اور حرکیت کو سب انسانوں کے سامنے روزِ روشن کی طرح یوں اجاگر کرتی ہے: (۱) وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا (۶: ۱۶۵، ۳۵: ۱۸، ۵۳: ۳۸۔ علاوہ ازیں دوسرے مقامات میں مختلف انداز سے اسی بات کا ذکر ہے)

(۲) لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى انسان کے لیے نہیں سوائے اس کے جو اس نے کوشش کی (۵۳ : ۳۹)

فخر و مباہات میں مبتلا ابلیس و شیطان ان دونوں حرکی قاعدوں کے وجدان سے قاصر ہیں وہ اپنے حال و مستقبل، استحقاق و مراتب کا پیمانہ اپنی ولادت اور اس کے ست کو (جو بالعموم خیالی ہوتا ہے) بناتے ہیں۔ بہرحال جو ان قاعدوں سے راضی نہیں وہ زمانِ حقیقی کا منکر اور دائرہ اسلام سے باہر ہے۔ ان قاعدوں کی عمل پیرائی کا مطلب ان کے ہاں خود ان کی اپنی منزلوں کو مسدود کرنا ہے۔ عزازیل (ابلیس کا اصلی نام یہی مشہور ہے) نے یہی مطلب نکالا تھا۔ چنانچہ شیطانیت کا چرخہ جیسا عزازیل کے ہاں ہوا ان کی ذات و عمل میں پورے طور پر جاری ہو جاتا ہے۔ اگر ان کے کچھ لائق ذکر یا بہت سے قابلِ قدر کام بھی ہوئے تو ان کی مثال یہ ہے کہ ایک ایسا جہاز ہے جس پر بہت سا قیمتی سامان لدا ہوا ہے۔ مگر اس کے پیندے میں سوراخ ہے وہ ڈوبنے والا ہے اس کے ساتھ اس کا سارا قیمتی سامان بھی۔

زمانہ کی اندرونی ماہیت یہی ہے کہ (۱) کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا اور (۲) ہر ایک کے لیے وہی ہے جو اس نے سعی کی۔ زمانِ مسلسل ان ہی قاعدوں کی گواہی دیتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور مستقبل اسی تقدیر کو ظاہر کر لیتا جو ان قاعدوں میں مضمر ہے آنِ دائم سے بھی اسی کا اظہار ہوتا ہے

آنِ دائم (یا حاضر) جو تمام گزرتی آنات میں بھی موجود ہے اور تمام آنے والی آنات میں بھی اس کی تشبیہ ایک کنارہ سے دی جا سکتی ہے اس کے پیچھے سارا لق و دق ماضی ہے اور سامنے جو ہے وہ ایک وسیع و عریض مستقبل ہے جو خود اس میں لحہ لحہ شامل ہوتا جائے گا اور یہ کنارہ آگے بڑھتا جائے گا۔ یہ کنارہ وہی عینِ ذات ہے جس کی پشت پر سارے ماضی کا بوجھ ہے۔ وہ اس سارے بوجھ کے ساتھ آگے قدم رکھتا ہے۔ ہر ایک کی عینِ ذات، اس کی آنِ حاضر و دائم ایک ہی بات ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ اگلے قدم کی کیا نوعیت ہوا کرتی ہے ہمیں اسی منطق کا حوالہ دینا پڑتا ہے جو سارے ہست و بود میں جاری و ساری ہے۔ چنانچہ تمام دانش عالم بشریت میں کرما کے اصول کے سامنے عاجز ہوتی ہوئی نظر آتی ہے جس کا مختصر حاصل یہ ہے کہ جو جیسا کریگا بھرے گا یا جیسا بوئے گا کاٹے گا۔ اس اصول کے مطابق ہر فصل اپنے پیچھے کی گئی محنت کے موافق ہوتی ہے۔ زندگی جس سعی و کوشش سے عبارت ہے مستقبل اس کا ثمر ہے۔ بنیادی اسلامی

ایقان کے جن دو قاعدوں کا ذکر اوپر ہوا ہے کہ کوئی اٹھانے والا کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور ہر انسان کے لیے وہی جو اس نے کوشش کی اسی اصول کرما کی فروعات ہیں۔ چنانچہ اسلام کے لیے دین کی اصطلاح جو خود قرآن حکیم نے استعمال کی ہے "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" اس میں اسی اصول کی پوری رعایت ہے۔ دین میں اصولِ کرما کے دونوں پہلو یعنی عمل اور اس کی جزا شامل ہیں بلکہ دوسرے پہلو پر زیادہ ہی زور ہے۔ باری تعالیٰ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ مالکِ یوم الدین ہے یعنی یومِ جزا کا مالک ہے۔

ہیئتِ زماں میں انسانی نقطۂ نظر سے دو اعتبارات ہی قابلِ لحاظ ٹھہرتے ہیں۔ ایک کرما اور اس کا پھل، سعی اور اس کی جزا۔ زمان کا وہ پہلو جو کرما یا سعی کہلاتا ہے اگر ماضی ہوا تو اس کا وہ اعتبار جو پھل یا جزا کہلایا مستقبل شمار ہوتا ہے۔ اگر اصولِ کرما کو بلا مزید تقلید عالمگیر سمجھا جائے تو مستقبل کا سارا وجود ماضی کا محتاج اور اس کا رہین ہو جاتا ہے۔ اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اگر آنِ حاضر میں کھڑا ہر آدمی صرف ماضی ہی کا ساختہ پرداختہ ہے تو پھر اس کا آنے والا وقت بھی اسی ماضی کا ساختہ پرداختہ ٹھہرتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر کوئی مستقبل ہی نہیں ہوا اور یوں سارے کا سارا مستقبل ماضی کا پرتو ہوا۔ تب تو یہ دعویٰ سچ ثابت ہوا کہ جو ابتدا میں تضاد ہی انتہا میں ہوا اور یہ سچ ہیں بھی وہی تھا جو لوگ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ سعادت و شقاوت ازلی ہیں وہ اسی کے تو قائل ہیں کہ سارا مستقبل بہر طور ماضی کا آئینہ ہے۔ چنانچہ بہت سے افراد اور گروہوں میں گردش کرنے والا ابلیسی تفکر اسی کا تو مدعی ہوتا ہے کہ سب مستقبل کا تسفیہ اصلاً ماضی سے ہو گیا، ادنیٰ اعلیٰ مقدر کا فیصلہ ماضی میں ہو گیا اور روشنائی خشک ہو چکی۔ کائنات میں اس "امرِ حق" کے خلاف کوئی ہل چل دکھائی دے، آدمیوں میں حرکت ہو تو یہ وہ گمراہی اور اندھیر ہے جس کا فوری سدِّباب ضروری ہے۔ لوگوں کو دبا دو۔

اس استدلال میں جو شیطانی پھیر اور مغالطہ ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ماضی اور مستقبل کا تو ذکر ہے مگر حال کا ذکر سرے سے غائب ہے تمام عمل ماضی بننے سے پیشتر حال ہوتا ہے اور ہر حال میں جہاں ماضی سے وابستگی پائی جاتی ہے کہ ماضی کے بعد یہی حال کا وجود ہے، وہیں اس میں ماضی سے حریت اور رہائی بھی پائی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حال کا وجود ہی نہ ہوتا۔ اور زمانہ ماضی کی حدوں سے آگے نہ بڑھتا۔ یہ حال نمود اور اس کا وجود ہی ہے جو ماہیتاً سرتاسر عمل ہوتا ہے اور جو اپنی باری میں مستقبل کی نمود میں ثمر آور ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ خیال کہ مستقبل ماضی اور صرف ماضی

کا نتیجہ ہے نری شیطانیت ہے۔ ہم مستقبل کے عقب میں ماضی نہیں بلکہ حال اور اس کی سعی و کوشش ہوتی ہے۔ چنانچہ حال نیز مستقبل میں کوئی نہ کوئی ایسی اہم بات ضرور ہوتی ہے جس کو ماضی کا پرتو یا اس کی تکرار نہیں شمار کیا جا سکتا اور نہ ہی پورا ماضی کھنگال لینے کے بعد اس کا سراغ مل سکتا ہے حال کا اندازہ کرنے کے لیے خود حال کا احصاء ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ خود آنِ حال کی یہ ماہیت، ہے کہ وہ آناتِ گزشتہ کی توسیع یا ان کا اعادہ نہیں ہوتی بلکہ ان پر اضافہ ہوتی ہے اور یہ اضافہ زمانہ کی حرکیت اور ماضی سے اس کی حریت پر دال ہے۔ یہ امور واقعی ایسے ہیں جن سے ماضی کی زنجیریں کٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور شقاوت و سعادت کے ازلی ہونے کے ابلیسی دعوے بالکل ہی جھوٹ اور باطل قرار پاتے ہیں۔ خود تحریر اسلام سے آشکار ہیئت زماں کے یہ اصول کہ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور ہر ایک کے لیے وہی ہے جو اس نے سعی کی ان ابلیسی تخیلوں کی جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکتے ہیں جو ماضی کو بنیاد بناتی ہیں۔ کائنات کی ساخت و پرداخت میں ان کا کوئی مقام نہیں۔

ماضی کی جبریت بھی بہرحال ایک ایسا امر واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس ساری جبریت کی حقیقت و حیثیت ایک تمہید کی سی ہے جس کے بعد حال کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کو ایک مادی بنیاد قرار دے سکتے ہیں جس کا جیسا ماضی ہوتا ہے اس کی اضافت سے اس کے ماحولیاتی حالات ہوتے ہیں مگر حال میں جو اپنا ذاتی اثبات پایا جاتا ہے اس کا مطلب اپنے اس ماضی سے بلند ہونا اور اس سے گزر جانا ہے اسی لیے حال میں جو کچھ ہونے والا ہے ماضی کی تمام پیمائش سے اس کا پتا نہیں چل سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کی تعمیم سے حال اور مستقبل کا احاطہ ممکن نہیں۔ یہ حرکت اور عمل کی کائنات ہے۔ ہر آن موجودہ یا حالِ جاریہ کا اپنا انفرادی بے مثل وجود اس کے اپنے عمل و حرکت سے عبارت ہوتا ہے اور اسی لیے ہر آن خود اپنی ذات سے قابلِ توجہ یا ناقابلِ قدر ہوتی ہے۔ اچھے کارناموں یا کرتوتوں سے وہ معتبر یا غیر معتبر ٹھہرتی ہے نہ کہ ماضی کے وسیلہ سے کوئی پست آدمی یہ کہہ کر بری الذمہ نہیں ہو جاتا کہ میرا ماضی پست تھا اور نہ کوئی شخص آج بلندی کا مستحق قرار پا سکتا ہے کہ میرا ماضی بہت بلند تھا۔

مندرجہ بالا حقائق کی تعمیم اس طرح کی جا سکتی ہے کہ ہر عصر، ہر قرن، ہر عہد، ہر آن، ہر عمل بلکہ ہر آدمی فی نفسہٖ اس کا حقدار ہے کہ اس کا محاسبہ خود اس کے حوالہ سے کیا جائے اور خود اس کی اپنی ذاتی قدر کا تعین کیا جائے۔ چنانچہ انوارِ قرانیہ کے اساسی ضابطوں کے مطابق ہر عصر

ہر قرن، ہر عمل، ہر دن، ہر ساعت اور ہر فرد بلا واسطہ ـــــ نہ تو ماضی کے حوالہ سے نہ مستقبل کی وجہ سے ـــــ براہِ راست جنابِ باری کی حضوری میں ہے اس لیے ہر قرن و عہد، عمل و انسان صرف اور صرف اس کی اپنی ذاتی ہوئیت کی بنا پر قابلِ وزن اور لائقِ تقدیر ٹھہرتا ہے نہ کہ اس بنا پر کہ وہ کسی اور قرن، عہد، یا بشر و قوم کا وسیلہ تھا یا کسی اور عہد و عمل و قرن کا نتیجہ تھا۔ کوئی عمل یا قرن، بشر یا گروہ اپنے آپ سے اور اپنے آپ میں کیا تھا اس پر اس کے وجودِ ذاتی مرتبہ کا تعین ہوتا ہے اس امر کو اس جنابِ باری کے ہاں ہم نے بلا واسطہ حضوری سے تعبیر کیا ہے اور اسی بصیرت افروز امر کو قرآن حکیم نے اس طرح کھول کر بیان کیا ہے۔ "فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ" (۹۹: ۷-۸)

ذرہ ذرہ کا حساب زماناً اس لیے ممکن ہوا کہ آنِ حاضر نے جو زمانہ کی رو میں آن بسیار بھی تھی ان سب اعمال اور باتوں کو جو بظاہر رفتِ گزشت ہو میں گزر سے وقتوں کی خاک ہوئیں ان میں سے کسی کو بھی ضائع ہونے نہیں دیا۔ ہمیشہ اپنے ہیکلِ وجود میں تمام ماضی اور حال کو سمیٹ کر آگے بڑھتی رہی اور اب وقت آنے پر اس نے ہر چیز سب کے سامنے الٹ دی۔ پہلے تو اس آن کا دنیاوی زندگی میں سرسری سا احساس ہوتا تھا اب پوری تفصیل کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی۔ اس کا باقی ذکر بعد میں تقابل کے لیے دوسری بات بھی سنی جائے۔

ادیانِ ہند نے بھی اپنا مدار جیسا کہ مذکور ہوا کرما اور اس کے پھل پر رکھا مگر اس کو انھوں نے اواگون چکر کی صورت میں کارفرما قرار دیا۔ ایک جنم اور اس کے جون میں جو کچھ بویا گیا وہی آنے والے جنم اور جون میں کاٹا گیا۔ اس پورے عقیدہ میں پراکرتی (عالمِ فطرت) کے ان روز و شب کے علاوہ جن سے ہمارا زمانِ حادثہ عبارت ہے کسی اور زمان کا تصور نہیں ہے اس لیے تمام مکافاتِ عمل اور ایک حیات کے بعد دوسری حیات، جنم بعد جنم انھوں نے اس زمان میں متخصص کی اور اس دھرتی پر متخصص کی آج کے جنم میں جو جون ہے اور پچھلے جنم کے کرموں کا پھل ہے چاہے کڑوا ہو یا میٹھا اور آئندہ جو جنم ہوگا وہ اس موجودہ جنم کے کرموں کے کارن ہوگا۔ مکافاتِ عمل کا یہ اٹوٹ چکر ہے جو یونہی چلا رہے گا اور اسی دھرتی پر جاری رہے گا اسی رات دن کے سلسلہ میں۔

اس پورے نظریہ یا دین (جزا و سزا کے نظریہ) میں حساب کتاب کا ذرا سا بھی شائبہ نہیں۔ اعمال ہیں اور ان کے لازمی قطعی نتائج جن سے کچھ مفر نہیں نہ پچھلے جنم کے تمام اعمال کا پورا پھل آج کا جنم ہے۔ یہ بھی پتا نہیں کہ اس پچھلے جنم میں کیا تھے اور کیا کر گئے تھے۔ اگر اس وقت

نچلے گھرانے میں جنم لیا یا تو یہ ہوا کہ کسی حیوان کے درجہ سے ترقی کرکے ادنیٰ درجہ کے پرش کے جنم میں نمودار ہوئے یا اگر منیش تھے تو بہت ہی نیچ کام کیے ہوں گے کہ نیچ کے ہاں جنم لیا۔

خلاصہ یہ کہ ادیانِ ہند میں اعادۂ حیات تمام کی تمام مکافاتِ عمل سے ہے اور اسی زمان حادث میں اس کی بار بار تکرار ہوتی رہتی ہے۔ یہ غیر شخصی غیر انفرادی قانون مکافات ہے جو اس زمان کی باطنی ماہیت کے طور پر جاری و ساری ہے۔

ہندی افکار کی ان وضاحتوں کے بعد قرآن حکیم کے دینی تصور (جزا و سزا کا نظریہ) کی طرف لوٹتے ہیں جس کے مطابق کوئی لمحہ یا عمل ضائع نہیں ہوتا۔ ہر کام کا اپنا ذاتی وزن اس کی اپنی ذاتی منفی یا مثبت قدر و قیمت ہوتی ہے چنانچہ ہر بات ہر کام کا رتی رتی کا حساب کتاب ہے۔

پورے زمان گزراں میں آنِ حاضر کا دوام اور کسی نہ کسی طور ہر ہر عمل کا اس میں وجودِ تفصیل حساب کے برحق ہونے کی طرف لے جاتا ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ کچھ نہ کچھ مکافات کا سلسلہ افراد و اقوام میں تو ہر وقت چلتا رہتا ہے جو بجائے خود آنِ حاضر کے دوام پر ایک شہادت ہے، لیکن اس کی پوری تکمیل مکمل حساب کتاب کے ذریعہ ہی ممکن ہے کہ یہ وجودِ انسانی اور شعورِ انسانی کے مرتبہ کے مطابق ہے کہ ہر ایک کو اپنے اپنے کاموں کے بارے میں عرض و معروض کا بھی موقع ملے اور اس کے بعد ان کے بارے میں فیصلہ ہو۔ تمام زمانہ کی حرکیت میں یوم الدین یعنی حساب و کتاب نیز سزا و جزا کے تعین کے دن کا ہونا پوشیدہ ہے۔ یہ آنِ حاضر کے تمام و کمال ظہور کا دن ہے اس دن کی موجودگی کے آیات و آثار ہماری زندگی میں بکثرت ملتے ہیں۔

ہماری یادداشت کیا ہے؟ یہ تو خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک نہ ایک صورت میں آناتِ گزشتہ اور ان کے اعمال موجود ہیں۔ آج یہ خیالاً ہمیں موجود نظر آتے ہیں تو کل حقیقتاً موجود بھی نظر آسکتے ہیں۔ اگر ہم اپنی یادداشتوں پر بہت مرتکز ہو کر تامل کریں تو اب بھی وہ ہمیں بالکل جیتی جاگتی زندگی سے بھرپور نظر آئیں گی۔ علاوہ ازیں ہمارے خواب جو ماضی اور حال کے مختلف تجربات کی تالیف ہوتے ہیں ان سے بھی اسی بات کی شہادت ملتی ہے کہ ایک دن ہر گزری آن اور ہر عمل پوری زندگی کے ساتھ حاضر ہو جائے گا۔ اسی کو حشر و نشر کہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر شخص کے کام اور عمل اس کی گردن بلکہ حلقوم سے بندھے ہوئے ہیں جو ایک نہ ایک وقت پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آحاضر ہوں گے۔ یوں بھی اگر کوئی شخص بھول جائے تو یاد دلانے پر اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ بے شک یہ میرے ہی اعمال تھے۔

ان سب مشاہدات، آثار و آیات سے جو بات آشکارا ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ زمانہ ایک خطِ گزراں نہیں صرف ایک لکیر گزرتا جانے بلکہ حقیقتاً یہ خود آنِ حاضر، آنِ دائم، آنِ سیال ہے جس میں تمام آنات حادثات اپنے اپنے مخصوص طور پر ہیں۔ اسی زمانہ کا پورا مشاہدہ حشر و نشر ہے زماں کی حقیقی منفرد ماہیت یہی ہے تمام لمحات گزراں آنِ حاضر کے محیط میں اپنی جملہ کڑیوں اور نسبتوں کے ساتھ اپنی پوری ٹھوس حقیقتوں کے ساتھ جب ہمارے سامنے ہوں گے اس وقت ہم اس زمانِ حقیقی کو دیکھیں گے جو ہمارا دوران تھا اس کا یہی منظر حشر ہے۔ اس وقت ہماری نگاہ لوہے کی طرح برما دینے والی اور تلوار کی کاٹ سے زیادہ تیز ہو گی۔ لاشعاعیں بھی اس نگاہِ تیز و تند کے سامنے ہیچ ہوں گی۔

جس بات پر زور دینا ہے وہ یہ کہ ٹھوس طور پر تمام آنات، گزراں آنِ حاضر و دائم میں اس وقت بھی پورے طور پر موجود ہیں اور اپنے پورے وجود کے ساتھ ہیں اس لیے زماں کی ماہیت اصلی دائماً حشر ہی ہے صرف ہمیں اس کا پورا ادراک نہیں ہے۔ اس لیے حشر ہمیں مستقبل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ اپنی کم آگہی کمزور ادراک اور ضعفِ نگاہ کی وجہ سے ہے۔ قرآنِ حکیم آگاہ کرتا ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ پردہ آنکھوں سے ہٹ جائے گا۔ ہماری آگہی کے ابعاد بڑھ کر کہیں سے کہیں پہنچیں گے اس وقت ہمیں پورا پورا دکھائی دے گا۔ ہمارے اپنے وجود کی وقوفی قوت میں اتنا اضافہ ہو گا تمام قرنوں، صدیوں، دہائیوں بلکہ آنوں کو اپنی جملہ حشر سامانیوں کے ساتھ بیک جنبشِ چشم دیکھیں گے۔ تب وہ سمے حساب و کتاب کا ہو گا۔ گویا جو کچھ مستقبل میں پنہاں ہے وہ ہر ایک کا اور سب کا پورا پورا احساب کتاب ہے۔ جہاں تک حشر اور اس کے ابعاد کا تعلق ہے وہ تو آج بھی ہے۔ بہرحال ہماری اپنی قوتوں اور نسبتوں کے لحاظ سے حساب کتاب کا دن ہی ہمارے لیے حشر و نشر کا دن ہو گا۔ یہی یومِ نشور ہے۔ اسی کو الساعت کہا گیا ہے۔ اس وقت یا ساعت تمام نسلیں اور تمام مخلوق (کم از کم ارضی مخلوق) خواہ ان کا کوئی زمانہ ہو موجود ہوں گی۔ اور اس طرح موجود ہوں گی کہ ان کی ترتیب و ترکیب زمانی کی جملہ نسبتوں میں سے کسی میں رتی برابر کمی نہ ہو گی۔ چنانچہ ہر شخص نہ صرف اپنے آپ ہو گا بلکہ اپنے قرن اور عصر کے ساتھ موجود ہو گا اس طرح یومِ نشور تمام زمانہ ہائے گزراں، تہذیبوں، ثقافتوں، گروہوں، قوموں اور انسانوں کا ہمہ وجود ہے۔ آنِ حاضر کا مدام تجربہ (اور یہ اجمالاً ہے) جو ہمیں ہر وقت حاصل ہے کہ ہر وقت ہر شے کو ہم نے آنِ حاضر ہی میں دیکھا اور ہر عمل اور کام کو بھی اسی آن میں موجود پایا اس امر کی کافی شہادت

ہے کہ اس کے بعد کسی اور شہادت کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

مندرجہ بالا جائزہ سے حتمی طور پر یہی انکشاف ہوتا ہے کہ زمانہ کی اصلی ساخت آن حاضر ہی ہے۔ زمانہ کا کوئی لمحہ، کوئی تجربہ اس سے باہر نہیں۔ اس کے اندر سب سموئے ہوئے ہیں۔ زمان گزراں میں یہی آن حاضر سیال معلوم ہوتی ہے۔ اس کے محیط میں ماضی، حال، مستقبل صرف اضافی اعتبارات ہیں۔ دیکھا جائے تو آن حاضر بذاتہٖ ایک ایسا مکان ہے جس کے اجزائے واقعی کے درمیان زمانی نسبتیں یا روابط پائے جاتے ہیں۔

یہ تیقن کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ سب زمانہ کو سب آدمی دیکھیں گے اور ہر زمانہ کے سب لوگ بلکہ تمام زمانوں کے لوگ ایک ساتھ حاضر ہوں گے۔ یہ تیقن بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آن حاضر دوام وجود اور مکان ہے اور یہ کہ مکان کے تمام گزراں زمانوں اور سلسلہائے حوادث سے برتر اصول ہے۔ زمان صرف اسی وقت بامعنی بنتا ہے جب وہ مکان کی حیثیت سے موجود ہو کہ اس کی کوئی چیز گم گشتہ نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں زمان بحیثیت زمان گزراں خود مکتفی وجود نہیں ہے۔ چنانچہ کائنات کی حقیقت تمام اپنی ماہیت میں زمان گزراں (یا حادثہ) نہیں ہو سکتی۔ البتہ وجود مکان کی بات اور ہے۔ مکان کا یہ تصور کہ وہ تمام گزراں زمانوں کی ترتیب کل ہے یا سب حادثہ زمانے اس میں ہم جا ہیں۔ ہمہ محیط حقیقت سے قریب ترین بات ہے۔ ہر زماں گزراں محیط مکان کے صرف ایک پہلو کا کوئی جزو ہوا کرتا ہے اس لیے کہ زماں تر گزرے ہوئے لمحات کا سلسلہ ہے جبکہ وہ صرف مکان ہی ہے جو آن حاضر (دائم) کی صورت میں مشہود ہوتا ہے اور اس طرح ان لمحاتِ گزراں کا اصول وجود قرار پاتا ہے۔ اس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ حشر و نشر ہی تمام زمان کی اصل حقیقت ہے اور یہ ماہیتاً مکان ہے۔

حشر و نشر اپنی ساخت میں نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی تجربہ یا حقیقت ہے۔ مثلاً تمام ارضی موجودات یا کم از کم سب انسان جب وقت آئے گا تو اس حشر نشر کا تفصیلاً مشاہدہ کریں گے اس امر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آن حاضر (سیال و دائم) کوئی فردی تخصی تجربہ نہیں بلکہ اجتماعی تجربہ بھی ہے۔ فرد کی ذات میں ہی اس کا احساس نہیں ہوتا بلکہ کل انسانیت اس کے محیط میں محسوس ہوتی ہے۔

سماج کی ساخت پر یونہی سرسری سی نظر ڈالی جائے تو یہ بھی آن حاضر معلوم ہوتا ہے جس میں اس کے مختلف زمانے اپنے اجتماعی اعمال کے ساتھ، گروہی ریتوں و رواجوں اور ان کے اثرات

اور پھیلوں کے ساتھ یکجا و ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے آپس کے روابط، پھیلاؤ اور ہم آہنگی سے اجتماعی مکان کا ڈھانچا تیار ہوتا ہے جو حقیقی معاشرت اور اس کے ماحول کا متوازن محل بن جاتا ہے۔ معاشرتی اعمال کے جملہ استقبالی رُخ کے پس منظر میں یہی ماحول ہوتا ہے اور ہر پیش منظر اپنے متوازن پس منظر سے ٹھوس طور پر وابستہ ہوتا ہے۔ اگرچہ اس میں نیاپن بھی ہوتا ہے محض ماضی سے وابستگی ہی نہیں پائی جاتی اس لیے کہ زمانہ کی حرکیت میں ہمیشہ ماضی سے رہائی کا پیغام بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔

بعض افراد اور بعض قوموں کے آج کے ضمیر پر ماضی کا دباؤ بہت شدید معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس لیے کہ ان کی قوتِ عمل بہت کمزور ہوتی ہے جس کی ذمہ دار وہ خود ہوتی ہے پھر تو ان کا نہ کوئی حال ہوتا ہے اور نہ مستقبل۔ یہ ان کا ماضی یا اس ماضی کا کوئی لمحہ ہے جو دوام اختیار کر لیتا ہے۔ ایک ایسا اندھا کنواں (بلیک ہول) جس کی گہری چھائی ہوئی تاریکی اور اس کی قوتِ ثقل سے کوئی آن آزاد ہوتی ہوئی نہیں معلوم ہوتی اور نہ کوئی کرن اس میں سے مستقبل کی جانب پھوٹتی دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ ان قوموں اور نفوس کا سلسلۂ آنات رک جاتا ہے مگر ان کی آنِ حاضر تو ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ یہی آن حشر برپا ہونے پر اپنے ساز و سامان افراد و اقوام کو سب کے سامنے لا حاضر کرے گی۔ تاریک قوموں کو ان کے تاریک حال کے ساتھ۔

گزشتہ ابواب میں یہ بات ہم واضح کر چکے ہیں کہ ادنیٰ زمان مکاں اعلیٰ زمان مکاں میں شامل ہوتے ہیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کا یہ فرق رخوں یا ابعاد کے حوالے سے قائم ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ادنیٰ ساعت/نقطہ مثلاً دو خطوط کا ایک دوسرے سے ملنے (یا منقطع کرنے) سے بنتا ہے۔ اس سے اعلیٰ ساعت/نقطہ تین خطوط سے قائم ہوتا ہے اس سے اعلیٰ تر نقطہ/ساعت چار خطوط کے انقطاع سے قائم ہوتا ہے۔ اس بیان سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ادنیٰ زمان کل اعلیٰ زمان مکاں کے اندر شامل ہوتے ہیں۔ اس بیان سے مزید یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو موجودات جتنے زیادہ ابعاد میں ہوتے ہیں اتنے ہی زیادہ وہ اعلیٰ و ارفع ہوتے ہیں۔ ان کا دائرۂ وجود اور دائرۂ عمل اتنا ہی زیادہ وسیع تر اور عظیم تر ہوتا ہے۔

یہ دنیا ہے ہی جیسی کچھ ہے، بہت سے دانشور خاص طور پر علمائے طبیعیات کہتے ہیں کہ ہماری یہ دنیا چہار ابعادی ہے۔ ان کے اس تصور میں عالم بشری کے بارے میں وضاحت نہیں ہے کہ انسان ہے تو اس چہار ابعادی عالم میں مگر خود اس کے اپنے وجود اور عمل میں کتنے ابعاد

ہیں جن کا واضح ادراک نہیں ہے اس بارے میں بہت کم روشنی پڑتی ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق جو اس دنیائے کم آگہی کی آخرت یا زمان حادث کی منزل یعنی اگلی زندگی ہے۔ وہی حیوان ہے (۲۹ : ۶۴) یعنی زمان گزراں میں بسر کی ہوئی حیات سے کہیں زیادہ بھرپور گویا اس زمان میں بسر کی ہوئی حیات اس بڑی حیات کے صرف چند ابعاد پر مشتمل ہے جو آنے والی ہے۔ یہ سوچنا بالکل گمراہی ہے کہ وہ عالم خلود صرف زمان گزراں کے آخر میں واقع ہوگا اور وقت کے پیمانہ پر صرف بعد کی بات ہے۔

وہ عالم خلود تو ہر وقت موجود ہے اسی کے چند ابعاد پر ہمارا زمان گزرا اور ہم مقررہ طور پر موجود اور حرکت پذیر ہیں اس عالم خلود کی جھلکیاں تو ہم اپنی اس زندگی میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارا یہ احساس کہ فلاں وقت بیکار گزر گیا اور فلاں کام تو خسارے کا سودا تھا مگر فلاں فلاں اعمال بڑے بڑے گراں قدر تھے۔ یہ احساس ان تجلیات کی طرف اشارہ ہے جن کا منبع عالم خلود ہے اور یہ اشارہ ان ابعاد کی بھی تجلیات ہے جو ہم پر صاف صاف بہت بعد میں ظاہر ہوں گی مگر وہ اس وقت بھی موجود ہیں۔ بھرپور مکافاتِ عمل کا ان ابعاد سے تعلق ہے مگر ہم اس وقت ان ابعاد اور مکافاتِ عمل کے تمام پہلوؤں سے بیگانہ ہیں۔

قرآن حکیم یہ واضح فرماتا ہے (۶۹ : ۱۷) کہ حشر برپا ہونے پر تیرے رب کا عرش اس دن آٹھ اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے (وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ) یہ اس امر کو واضح کرتا ہے کہ عالم بشری کا حقیقی زمان مکان آٹھ ابعادی ہے اس کا کوئی نقطۂ ساعت ایسا نہیں جس کے تعین میں آٹھ خطوط ایک دوسرے کو منقطع نہ کرتے ہوں۔ اسی وجہ سے وہ حیات جس کو ان آٹھ ابعاد کا پورا پورا شعور ہوگا اس حیات کے مقابلہ میں زندگی سے کہیں زیادہ بھرپور ہوگی جو ہم اس دنیا کے ابعاد میں بسر کرتے ہیں جو چار ابعادی دنیا کہی جاسکتی ہے۔

یہ آٹھ ابعادی زمان مکاں ہر وقت موجود ہے اور ہمارے زمان و مکان کی اصلی حقیقی ماہیت ہے مگر ہم اس کے صرف چار ابعاد میں وقت گزار رہے ہیں۔ ہمارے اعمال کے نتائج ہر وقت مرتب ہو رہے ہیں اور اپنے آٹھ ابعادی اصلی وجود میں کیا سے کیا بن رہے ہیں اس سے ہم بے خبر ہیں۔ صرف اس گھڑی جو آنے والی ہے ہماری آنکھوں سے پردہ ہٹے گا اور ہم سب کچھ دیکھیں گے۔ لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ

حدید (تو تھا اس سے غفلت میں تیرا پردہ ہم نے اٹھا دیا۔ آج کے دن تیری نگاہ فولاد ہے۔ ۵۰: ۲۲)، اس موقع پر انبیاء علیہم السلام کی معراج کا واقعہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ارشاد باری ہے کہ ان کو ملکوت سمٰوٰت والارض کی سیر کرائی گئی تھی اور بھی انبیاء کو ایسی سیر مل سکتی ہے مگر ہمارے علم میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج ہے کچھ لوگوں کا عام طور پر تصور یہ ہے کہ یہ اس عالم طبعی چہار ابعادی جہان مشہود کی سیر ہے اور اس کی سرعت کے بارے میں ان کی تشریح اس طرف گئی ہے کہ گزران وقت کو اس معراج میں معطل کر دیا گیا تھا اس میں رنگ آمیزی اس طرح بھی کی گئی ہے کہ مثال اس کی یوں ہے کہ ایک کھیت جوتتا ہوا کسان اپنی محبوبہ کو آتے دیکھ کر اس کی ناک کے لونگ کے لشکارے میں محو ہو کر جہاں تھا وہیں کھڑا ہو جاتا ہے اس کا سارا کام بند ہو جاتا ہے بس اس کے استقبال کے علاوہ اسے کچھ نہیں سوجھتا۔ وہ رب جہاں اپنے محبوب کی آمد میں اتنا محو تماشا ہوا کہ سارا کارخانۂ قدرت رک گیا۔ چنانچہ جب معراج سے آنحضورؐ کی واپسی ہوئی تو بستر گرم تھا اور دروازہ کی کنڈی ہنوز ہل رہی تھی۔ مگر ہمارا رب اس قسم کی تمثیلات سے بالاتر ہے۔

معراج شریف اس عالم گزران کی سیر نہیں تھی۔ نہ اس میں جن سمٰوٰت کا ذکر آیا ہے ان کا علاقہ اس عالم طبعی کے ارض و سمٰوٰت سے ہے۔ صرف مسجد اقصیٰ تک کے سفر کو آپ اس جہان میں سفر سے تشبیہ دے سکتے ہیں جدید قسم کی ایجادات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسجد نبوی (مدینہ سے) مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) کا سفر چند سیکنڈوں کی بات ہے مگر اس کے بعد کا سفر جو اصل معراج ہے وہ دراصل ہمارے زمان و مکان کے ان ابعاد میں سفر ہے جن پر ہماری آنکھیں ابھی قادر نہیں ہیں۔ وہ سفر اس اصلی زمان و مکان میں سفر ہے جو آٹھ رخوں (ہشت ابعادی) پر مشتمل ہے جس میں تمام مکافاتِ عمل اپنے بھرپور انداز میں موجود ہیں۔ چنانچہ آنحضورؐ نے جنت کا بھی نظارہ کیا۔ دوزخ کا بھی اور مختلف اعمال کے مختلف نتائج بھی آپ کی نظر سے گزرے اور رہا سرعتِ رفتار کا معاملہ تو جو سرعتِ رفتار ہشت ابعادی زمان و مکان میں ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ہمارے زمان و مکان تو اس کی گرد بھی نہیں ہیں۔

یہاں پر ایک واقعہ یاد آگیا جو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے بیان کیا ہے کہ لوگوں نے ایک بالکل اجنبی شخص کو ان تک پہنچایا جو لباس وضع قطع سے بلکہ عام بول چال میں سب سے مختلف نظر آتا تھا۔ اور تھا وہیں یعنی دہلی کا باشندہ۔ اس نے اپنا احوال جو ان کو بیان کیا وہ کچھ یہ تھا کہ محمد تغلق (جو اس

زمانہ سے قریباً تین سو سال پرانا عہد تھا) کی سرکار کا ملازم تھا کہ ایک دن اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا تدفین کے وقت اس کی جیب سے چند سکے قبر میں جا گرے جن کو اٹھانا وہ اپنے صدمہ میں بھول گیا بعد میں اس نے قبر کی کھدائی کر کے اپنے سکے نکالنے چاہے۔ دیکھتا کیا ہے کہ قبر میں بیوی نہیں ہے بلکہ ایک راستہ سا بنا ہوا ہے۔ وہ اندر گھس گیا، کیا دیکھتا ہے کہ ایک میدان ہے۔ اس میں ایک بنگلہ سا بنا ہوا ہے۔ وہ بنگلہ میں داخل ہوگیا دیکھا کہ اس کی بیوی ایک تخت پر بیٹھی تلاوت کر رہی ہے۔ اس مرحومہ کی نظر اس پر پڑی تو اس نے فوراً کہا کہ کیسے آگئے واپس جاؤ، فوراً جاؤ وہ اس حکم پر فوراً پلٹا اور قبر سے نکل کر باہر آیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ سارا ماحول بدلا ہوا ہے۔ اس پورے عرصے میں جو اس کے لیے صرف چند منٹ کا تھا، تغلق خاندان گزر چکا تھا، اور بھی خاندان اور بڑے بڑے تاجدار گزر چکے تھے، اب مغلوں کی سلطنت بھی دھندلا گئی تھی ان کا آخری طوائف الملوکی کا دور اور فرنگیوں کے عروج کا زمانہ تھا، لباس، وضع قطع، زبان، رسم و رواج ہر چیز میں بہت فرق آچکا تھا وہ لوگوں کا منھ تکتا اور لوگ اس کا منھ تکتے تھے۔ شاہ صاحب نے اس کو کہا کہ اب یہ دنیا تمھارے لیے نہیں رہ گئی بہتر ہے مکہ شریف چلے جاؤ اور حرم شریف میں معتکف ہو کر باقی دن پورے کرو۔ وہ راضی ہوگیا۔ شاہ صاحب نے اس کے جانے کا انتظام کر دیا۔ اس کی اپنی بیوی سے ملاقات عالم برزخ میں ہوئی تھی جو ہمارے چہار العبادی جہاں سے مختلف ہے۔ اس مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم برزخ کے چند منٹوں میں ہماری صدیوں کی صدیاں بیت جاتی ہیں۔ جب لوگ قیامت کے شور میں اٹھیں گے تو یہی کہیں گے کہ ہم ابھی ابھی تو سوئے تھے۔

معراج محمدیؐ اس سے بھی عجیب تر ہے۔ خود ہمارے چند منٹوں میں اس اصلی زمان مکاں کے ضروری مشاہدات پورے ہوگئے جس کے اندر مکافاتِ عمل کی پوری تکمیل جنت دوزخ وغیرہ ہیں۔ یہاں رفتار کی آخری حد ابعاد کی تعداد سے کس طرح سے متناسب میں ہوتی ہے ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ چنانچہ ہشت رخی زمان مکاں (جو حشر کی اصلی ماہیت ہے) میں جو سرعتِ رفتار ہے ہماری گھڑیاں، ہمارے منٹ اور سیکنڈ اس کا حال بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

ہمارے زمانِ مفروض (یعنی اس زمان گزراں) میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہر شخص کی تشکیل لمحہ بہ لمحہ ہوتی ہے اور یہ بشری حیات فی الاصل کئی ابعادی ہوتے ہیں کہ زمین پر شاید

ہی کسی اور مخلوق میں ان کی نظیر ملے۔ بہرحال ہر آدمی یوں اپنی ہستی میں "وجودِ تاریخی" یا "تاریخی موجودیت" ہے۔ روزِ ازل سے ہی اس تاریخی موجودیت میں مکافاتِ عمل کا پہلو یا بُعد بھی اس کا جزو ہوتا ہے اور اس کے آخری لمحہ تک یہ سب کچھ جاری رہتا ہے۔ گویا اس کی تشکیل اس کے آخری لمحہ تک ہوتی رہتی ہے۔ اٹھ کھڑے ہونے کے دن (یوم النشور) میں ہر ذی حیات اپنی اسی تاریخی شخصیت کے ساتھ نمودار ہوگا یہی اس کی سوانح حیات اور یہی اس کا نامۂ اعمال ہے۔ وہ اپنی شخصیت کے جملہ پہلوؤں یعنی ابعاد کے ساتھ پورے پورے قد کاٹھ کے ساتھ نمودار ہوگا اس دن اس میں حیات پورے عروج و کمال کے ساتھ ہوگی جو نظر آئے گا وہ کچھ اس طرح ہوگا:

یہ شخص کتنا جسیم ہے کہ سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا ہے جیسے کراچی سے پشاور تک اور کیسا پہاڑ سا ہے اس نے پوری زندگی کثافت کمائی، فسق و فجور کیا، ریاکاری (سود خوری) کی، لوگوں کا خون چوسا اور تکبر میں سے ہوا۔ پوری زندگی ایسے ہی اعمال سے اس کی تشکیل ہوتی رہی اب صرف یہ ہوا ہے کہ اس کی اور دوسروں کی آنکھیں کھلی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوا۔ چہار ابعادی گزرانِ عالم میں اس کو یہ سب کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا مگر ہشت ابعادی عالم اس کی جملہ حقیقت تھی جو ہمیشہ موجود رہی اب صرف اس کو دکھائی دینے لگا ہے اس کے اس پہاڑ سے جسم میں جو سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا ہے۔ خاردار جھاڑیاں ہیں۔ کتنے ہی خون اور پیپ کے ڈھاک اور تالاب ہیں۔ یہی تو اس نے کمایا تھا۔ اس کے دانت بڑے بڑے اور اس کے ناخن گزوں لمبے۔ یہی تو اس کی شخصیت تھی مگر اس دوسرے شخص کو دیکھو کتنا بلند بالا سبک و قد آور ہے اس کا تمام سراپا خوشبو اور نور سے بنا ہوا ہے۔ اس نے ساری زندگی لطافت ہی کمائی وہی اس کا جسد و بدن بن گئی۔

تمام لوگوں کو جیسے بھی بن پڑے، اٹھ کھڑے ہونے کے دن اپنے اپنے کمائے ہوئے بدنوں اور جسموں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہونا ہے۔ پھر ان کو پل پل کا حساب بھی دینا ہے۔ ان کا اپنا وجود ہی اُن کا آنِ حاضر تھا جو تمام عمر لمحہ پیدائش سے وفات کی ساعت تک سیال و قائم تھا۔ وہی ان کا عین وجود تھا۔ وہ ہمیشہ ہشت ابعادی رہا جبکہ وہ اس کو بہت کم کم یعنی چہار ابعادی ہی دیکھتے تھے۔ اب حشر و نشر کے دن وہ پورے طور پر اپنے جملہ ابعاد کے ساتھ اس طرح مقرون ہوا یا ان کی آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا کہ سامنے آگیا۔ اب ہر ایک اپنے زمانِ گزراں کے انجام تک پہنچ گیا۔ یہ انجام بذاتِ خود نئے زماں مکاں کا دروازہ ہوگا۔

جس کے ابعاد اور وسعتوں کے بارے میں بلاشبہ ہم کچھ نہیں جانتے

انجام سے قبل بھی کیا کوئی بُرا آدمی اپنا حشر بدل سکتا ہے۔ ہندی تفکر کا حاصل یہ ہے کہ مکافاتِ عمل کرما اور اس کا پھل لاینفک ہیں۔ ہر ایک کو وہی چکھنا ضرور ہے جو اس نے کیا کوئی اپنے انجام سے بچ نہیں سکتا مگر پھر بھی اس دین نے ایک راہ نکالی کہ جو کوئی کسی طرح اپنی زندگی کو زندگی کی ہر خواہش سے پاک کر لے وہ اپنے بُرے انجام یعنی خود کرما کے چکر سے نکل جاتا ہے۔ نروان یا "آزادی" کا یہ عالم بالا اس بات کی دلیل ہے کہ عالم گزراں یا مکافاتِ عمل سے بالاتر بھی کچھ ہے۔ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہندی تفکر نے نفی حیات کا جو راستہ دکھایا وہ کروڑوں، اربوں آدمیوں میں سے ایک آدھ کی بات ہو تو ہو عام تعلیم یا درس نہیں بن سکتا۔ پھر اس سارے تفکر کی بنیاد اس امر پر ہے کہ جو ہے سو پابند ہے (یہ حکم بجائے خود محلِ نظر ہونا چاہیے) جو نہیں ہے وہ بے قید ہے۔ مگر جو بے قید ہے وہی ساری حقیقت ہے اور وجودِ محض ہے اور وجودِ محض یہ نہیں ہے وہ نہیں ہے یہ ایک بڑی بحث ہے۔ اسے چھوڑیے۔ ہستی (یعنی یہ ہونے اور یا وہ ہونے) سے گزر جائیے تو نہ سنسار ہے نہ سنسار چکر ہے نہ پراکرتی کا گھومتا پہیا۔ غرض کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں ہے اور نہ فرق۔ وجودِ محض ہر فرق، ہر تعین سے بالا ہے۔ فرق و تعین، تمیز و امتیاز تو وہیں ہے جہاں لابھ ہے، خواہش ہے اور جہاں یہ ہو وہاں پھر چکر شروع ہو جاتا ہے۔ یہیں جیون ہے اور بار بار کا جنم۔ بہرحال ہندی ادیان نے یہی راستہ اختیار کیا نفی خواہش اور گیان مارگ جو سب امتیاز کی نفی کر کے نروان ـــــ وجودِ محض تک پہنچ جاتا ہے۔

انوارِ قرآنیہ ہر فرد کی تقدیر کا خود اسی فرد کی فردیت، انفرادیت و شخصیت کے دائرہ میں انکشاف کرتی ہیں۔ جبکہ اسی فردیت کے دائرہ میں ہندی دھرم کے مطابق کوئی بھی مکافاتِ عمل کی زنجیروں سے باہر نہیں جا سکتا۔ جو کچھ اس نے کیا بہر صورت اس کو بھگتنا ہے اس لیے کہ اصول کرما لاینفک ہے۔ مگر حکمتِ قرآنیہ کے مطابق تمام قانونِ تعلیل (جس کی ایک مثال کرما کا قانون بھی ہے) کی نیو ایک ایسے اصول پر ہے جو بذاتِ خود تعلیل کی زنجیروں سے ماورا ہے اور وہ ہے جناب باری تعالیٰ جس کی تعریف سورۃ الاخلاص میں یہ ہے۔ "اللہ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ"۔ وہ کسی طور علت و معلول کون و فساد والا اور مولود کے سلاسل میں نہیں آتا اور وہ ہمہ محیط ذات ہے جس کے سبب وہ سب علت و معلول کے

تمام سلسلوں کی بنیاد ہے اور ان پر متصرف و قاہر ہے اسی کی قدرت سے یہ ممکن ہے کہ وہ ایک سلسلہ اور اس کے نتائج کو بالکل موقوف کر کے بالکل مختلف سلسلہ شروع کر دے اور وہ پچھلا سلسلہ اپنے پھلوں سے اور نتائج سے محروم ہو جائے جبکہ یہ دوسرا سلسلہ اپنے پھلوں اور اثرات کے اعتبار سے دگنا، چوگنا ہوتا چلا جائے۔ اسی امر کو انقلاب کہتے ہیں افراد کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے اور اقوام کی بھی۔ انسانی تاریخ میں اس کی خاصی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تمام عالم طبعی کی بھی اسی طرح کایا پلٹ ہو۔ چنانچہ سلسلہ روز و شب دراز سے دراز تر ہو سکتا ہے اور نہیں بھی، یہ ممکن ہے کہ اس کا ایک سلسلہ ایک مقام اور ساعت پر اچانک رک جائے اور اس کے بعد دوسرا سلسلہ شروع ہو۔ اسی بنا پر اصول کرما بھی اپنی عمل پیرائی میں ساعت بساعت اپنے عواقب و نتائج کے ساتھ جہاں اٹوٹ طور پر جڑا ہوا ہے وہیں کہیں نہ کہیں سے ٹوٹ کر رک بھی سکتا ہے اور اب کسی طور وہ مستقبل پر اثر انداز نہیں ہو سکتا جہاں سے یہ ٹوٹا ٹھیک وہیں سے دوسرا سلسلہ بھی شروع ہو سکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ جہاں حیات ہے وہاں اصول کرما ضرور موجود ہے۔ اس کا ایک سلسلہ نہ سہی دوسرا سہی۔ اس سے مگر مفر نہیں "لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲ : ۲۸۶)" یہ سب کچھ اس لیے ممکن ہے کہ زمان و مکان کے تمام سلسلے اور مکافاتِ عمل کی سب زنجیریں اسی اللہ الصمد لم یلد ولم یولد کی مٹھی میں ہیں۔ وہی ان سلسلوں پر ان میں سے کسی ایک کی کڑی بنے بغیر پورے طور پر فعال و متصرف ہے۔

جب کوئی گرا پڑا انسان یا برائیوں سے لت پت معاشرہ اپنے نافابل بیان حالات اور پاپی کاموں سے بیزار ہوتا ہے تو قانونِ مکافاتِ عمل کی گرانباری سے اس کو مایوسی کے گہرے سمندر میں نہیں ڈوب جانا چاہیے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے برباد ہو گئے۔ وہ فرد یا گروہ اس جنابِ باری کی طرف متوجہ ہو تو وہ جنابِ باری بھی اس پر متوجہ ہو کر اس کو اپنے اعمال کی سزا تک پہنچنے سے پہلے گرداب سے نکال بھی سکتی ہے۔ اسی کو توبہ کہتے ہیں جب کوئی سرتاپا پورے طور پر اس جناب کی طرف رخ کرتا ہے اور کہتا ہے تبت الیک (میں تیری طرف متوجہ ہوا) اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (ہاں ہاں تُو تو ہے ہی سب توجہ ڈالنے والوں اور رحم کرنے والوں سے زیادہ توجہ ڈالنے والا رحم کرنے والا) تو وہ جناب اس کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں اور اس کو بچا لیتے ہیں۔

یہ توبہ جس کے دو رخ ہیں۔ ایک تو بندۂ پُرتقصیر کا اس کی طرف متوجہ ہونا اور دوسرا خود اس جناب کا اس بندہ پر متوجہ ہونا، ساری کائنات میں یہ وہ عمل ہے جس سے مکافاتِ عمل کا وہ سلسلہ جس میں اعمال ہی بذاتِ خود بُرے نقشے تھم جاتا ہے۔ اب اگر یہ بندہ ابھی اس توبہ کے ذریعہ پیچھا اپنے آپ کو بدل ڈالے اور نئی زندگی شروع کرے جو صاف ستھری ہو تو اس گزرے سابقہ سلسلے کے عواقب و ثمرات بھی مردہ اور بے اثر ہو جاتے ہیں۔ یہ مغفرت ہے اور نئے سلسلے کے اچھے اثرات سے مستقبل کی تعمیر ہونے لگی ہے۔ حشر میں یہ انسان خود دیکھے گا کہ اس کے بُرے اعمال موجود تو ہیں مگر اپنے بُرے ثمرات کے ساتھ وہ اس سے دور ہو چکے جبکہ اس کا اپنا قالب صرف اچھے اعمال اور ان کے ثمرات سے بنا ہے۔

زمان مکان کی ماہیت کے بارے میں جو انوارِ الٰہیہ سے پتا چلتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ہر ہر پل اور ہر ہر نقطہ میں خواہ کتنے ہی ابعاد یا رُخوں کا ان کی بناوٹ میں دخل ہو، ہر ایک میں جو ظاہر و باطن، اول و آخر ہے، وہ یہی حقیقت ہے ؛ اللہ الصمد لم یلد ولم یولد۔ اس امر کا مکمل استحضار اور وجدان یعنی روح، نفس، ارادہ، نیت اور عمل میں ظہور ہی ایمانِ کامل ہے جن کو ایمانِ کامل نصیب نہیں ان کو زمان و مکان کی حقیقت کا فوری حد تک بھی پتا نہیں چل سکتا۔ وہ ہمیشہ مختلف الجھاؤں میں ہی گرفتار رہیں گے جیا ستا دنیا ان کو رجھاتی پرچاتی رہے گی پھر بولاتی دہلاتی رہے گی۔ سب کچھ جانتے بوجھتے وہ اندھے بہرے ہی رہیں گے۔

DISCOVER THE WIDE WORLD OF ISLAMIC LITERATURE

There are an estimated 500 core journals and serial publications bearing relevance to Islam and the Muslim world.

- How many of these publications can you afford to subscribe to?
- How many of these can you find in your local library?
- Even if some of the titles are available, how many can you access on a regular basis?
- How much time and effort would you devote to locating these titles?

Answer: very little.

Here at last is an alternative: *Periodica Islamica*. As the world's premiere journal of current awareness, *Periodica Islamica* is your gateway to the literature on Islam and Muslims.

In its quarterly issues, it reproduces tables of contents from a wide variety of serials, periodicals and other recurring publications worldwide. These primary publications are selected for indexing by *Periodica Islamica* on the basis of their significance for religious, cultural, socioeconomic and political affairs of the Muslim world.

Browsing through any issue of *Periodica Islamica* is like visiting your library 100 times over. Four times a year, in a highly compact format, it delivers indispensable information on a broad spectrum of disciplines explicitly or implicitly related to Islamic issues.

If you want to know the Muslim world better, you need to know *Periodica Islamica* better.

SUBSCRIBE TO PERIODICA ISLAMICA TODAY

PERIODICA
ISLAMICA

Editor-in-Chief ■ Dr. Munawar A. Anees **Editor** ■ Harlina Samson **Consulting Editor** ■ Zafar Abbas Malik

Berita Publishing, 22 Jalan Liku, 59100 Kuala Lumpur, Malaysia. Tel: (+60-3)282 5286 Fax: (+60-3)282-1605

Subscription Order Form

Annual Subscription Rates:-

☐ Individual US$35.00 ☐ Institution US$70.00

Name : ____________

Address : ____________

City (+Postal Code) : ________ State : ________ Country : ________

☐ Bank Draft/International Money Order in US$ made payable to Berita Publishing

☐ American Express ☐ Visa ☐ Mastercard Expiration Date : ________

Card Account ☐☐☐☐-☐☐☐☐-☐☐☐☐-☐☐☐☐ Signature : ________